گرداب
از قلم مہک عارف

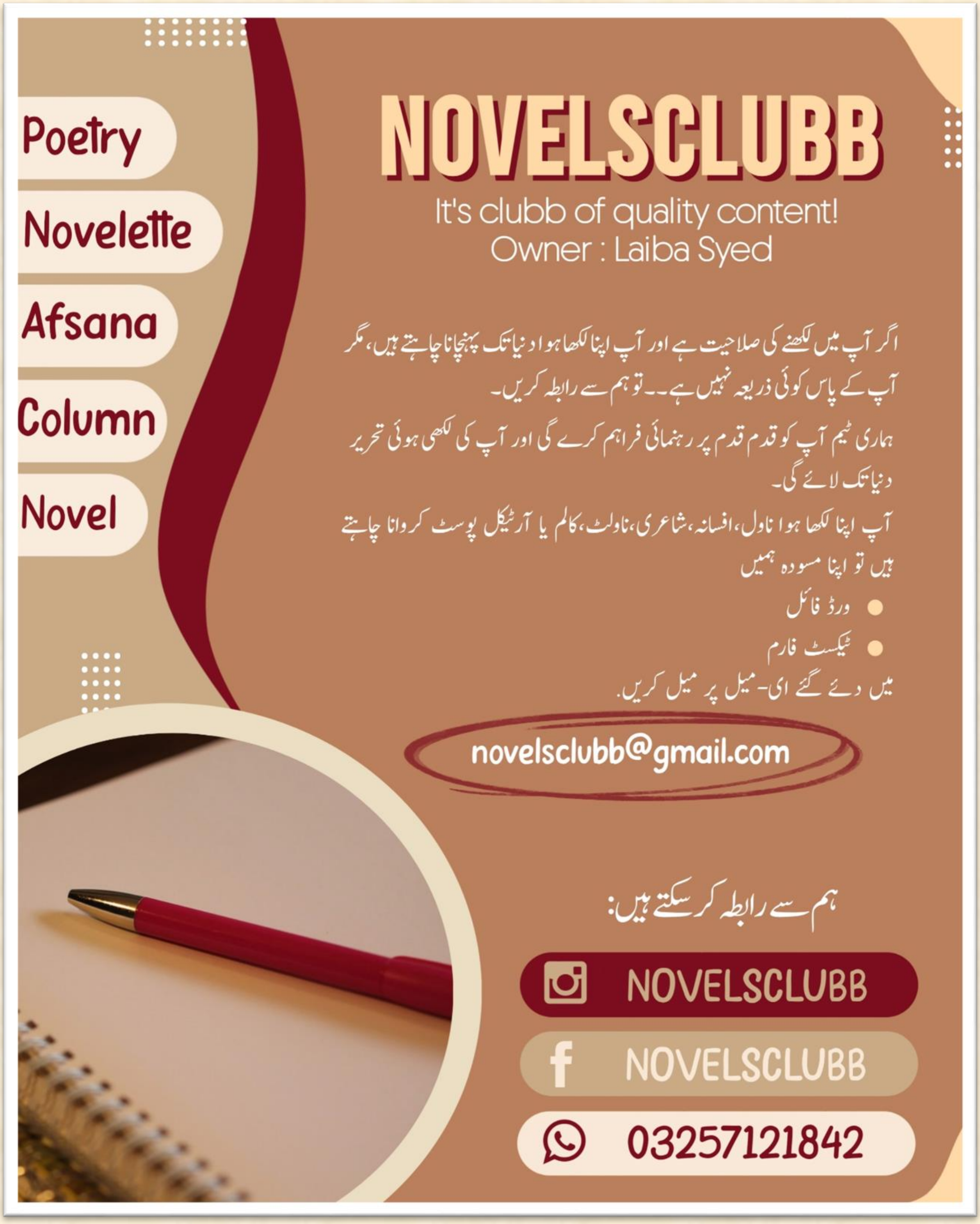

Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel
NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed
اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔ تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں
ورڈ فائل
ٹیکسٹ فارم
میں دئے گئے ای-میل پر میل کریں.
novelsclubb@gmail.com
ہم سے رابطہ کرسکتے ہیں:
NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

گرداب

از قلم

مہک عارف

Clubb of Quality Content!

گرداب

از قلم مہک عارف

(جب مجبوریاں بوجھ بن جائیں تو انسان گرداب بن جاتا ہے)

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

انتساب

گرداب کا ہر لفظ ''میرے اللہ'' کے نام۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

پیش لفظ

کچھ کہانیاں شروع ہی گرداب سے ہوتی ہیں۔

جس میں سے انسان جتنا نکلنے کی کوشش کرے، اتنا ہی ڈوبتا چلا جاتا ہے۔

گرداب میری تیسری تحریر ہے۔ میری امنگوں اور خوابوں کی تعمیر کی تیسری کوشش۔ گرداب کی کہانی میرے دل کے نہایت قریب ہے۔ جس نے مجھے ایسے سفر کا مسافر بنایا جو میرے لیے ایک طرح کی "ہیلنگ" ہے۔

آج، جب میں اس موڑ پر کھڑے ہو کر پچھلے دو سالوں پر نگاہ ڈالتی ہوں تو آنکھیں خوشی اور شکر کے احساس سے بھیگ جاتی ہیں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آٹھ دسمبر ۲۰۲۳ کو شروع کیا گیا یہ سفر مجھے یہاں لے آئے گا۔ جیسے مالی اپنے باغ میں پودے لگاتا ہے اور انہیں بڑھتے، پھلتے اور نشوونما پاتے دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے، میں بھی اپنے لکھے ہر لفظ کو کامیابیوں کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ انیتس مئی ۲۰۲۵ کو تاثیرِ عشقم کی آخری قسط شائع کرتے وقت میں نے سوچا کہ میں کچھ عرصہ بریک لوں اور اپنی ذات پر فوکس کروں مگر تین جون ۲۰۲۵ کی صبح، نیند سے بیدار ہوتے ہی ذہن میں ابھرنے والا اچھوتا

خیال میرے تمام ارادوں کی نفی کر گیا۔اس کہانی کا پلاٹ، سیٹنگ، کردار اور یونرا میں نے خود تشکیل دیے ہیں۔ گرداب کا نام چننے میں میرے قارئین نے میری بے پناہ مدد کی اور میں خاص طور پر اپنی ایک بہترین قاری کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے "گرداب" نام تجویز کیا۔اس نام کے بغیر میری کہانی کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ پچھلے چند ماہ سے جاری یہ سفر میری سخت روٹین کے بیچ آہستگی سے آگے بڑھ رہا ہے۔میں وہ لکھاری نہیں ہوں جو ایک گول سیٹ کر کے چند دنوں میں لاکھوں الفاظ کی اقساط لکھ دیتے ہیں۔پڑھائی، گھریلو کام اور سوشل میڈیا پر اپنے ناولز کی پروموشن کرتے ہوئے مجھے جو بھی فارغ وقت ملتا ہے، میں اسے گرداب کے لیے وقف کرتی ہوں۔اس لیے میں امید کرتی ہوں کہ اس سفر میں آپ گرداب سے جڑے رہیں گے۔

گرداب سے میرا رشتہ صرف مصنفہ اور کہانی کا نہیں بلکہ احساسات اور محبت کا ہے۔یہ میری زندگی کا اہم حصہ بن گیا ہے اور یہی تعلق، یہی قربت مجھے امید دلاتی ہے کہ ہر قاری اس میں اپنے آپ کو اور اپنی ذات کو پہچانے گا۔میری یہ تحریر زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے...ان کی اصلاح کرتی ہے، اور انہیں ایسے الفاظ میں ڈھالتی ہے جو قارئین کے لیے موزوں اور مفید ثابت ہوں۔

Clubb of Quality Content

ہم سب کبھی نہ کبھی ایسے گرداب میں پھنسے ہوتے ہیں، جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ مگر کیا واقعی زندگی ایک گرداب ہے؟ کیا اس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں؟ ان تمام سوالات کے جواب آپ کو گرداب پڑھ کر ملیں گے۔

میں اپنی پیاری دوست فضہ حمید کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے بطور ایلفا گرداب کو لکھنے میں میری ہر ممکن مدد کی۔ ہر موڑ پر میری کہانی کو بہتر بنانے میں ان کا کردار اہم رہا اور انہوں نے میری تحریر کو ہمیشہ سراہا، نکھارا اور میری خامیوں کی نشاندہی کی۔ محترمہ فضہ حمید، مہک عارف آپ کی دل سے مشکور ہیں۔ آخر میں، میرے تمام قارئین کا شکریہ۔ جنہوں نے ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے اس سفر میں آگے بڑھنے کی امید دلائی۔

جزاکم اللہ خیراً کثیرا!

۱۴۔ جنوری۔ ۲۰۲۶

مہک عارف

اسلام آباد۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

انتباہ

- گرداب ایک فرضی کہانی ہے۔اسے محض فکشن کے طور پر ہی پڑھا جائے۔
- اس ناول میں شامل کیے گئے تمام مناظر، کردار اور واقعات کسی بھی حقیقی شخص، مقام یا واقعے سے مطابقت نہیں رکھتے۔
- گرداب کا پہلا باب کہانی کی Door Opening ہے لہٰذا قارئین سے بالخصوص گزارش ہے کہ ناول کے آخر تک بتدریج کھلنے والے رموز کو حوصلے اور صبر کے ساتھ پڑھیں کہ ہر کہانی کا آغاز اس کے انجام کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔
- براہِ کرم گرداب کو اپنی ذہنی آمادگی کے ساتھ پڑھیں۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content!

باب: دوم

"دشتِ حسرتوں کا سماں"

یوسف صاحب کے گھر میں بارش کی ٹپ ٹپ ہنوز جاری تھی۔ کیاری میں اگے گلِ دوپہری کی کاٹ دار نگاہیں برآمدے پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں ایک جانب جالی دار کھلے دروازے کے ساتھ میرم ریحام کھڑی تھی۔ اسکی نظریں باہر صحن میں گرتے بارش کے قطروں میں الجھی ہوئی تھیں۔ اور برآمدے میں رکھے لکڑی کے صوفوں میں سے ایک پر وہ بیٹھا تھا۔ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے، ہتھیلیاں باہم الجھائے وہ سر جھکائے اپنے جوتوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی نگاہ اوپر نہیں اٹھائی تھی۔ کچھ دیر قبل بارش میں بھیگنے کے سبب اس کے کپڑے ہلکے نم تھے۔

"السلام علیکم!" شازیہ کے قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میرم بھی ایک دم سیدھی ہوئی۔ اب کہ اس کا رُخ ان دونوں کی جانب تھا۔

"وعلیکم السلام... بیٹھو۔" انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شائستگی سے واپس بیٹھ گیا۔

"کون ہو بیٹا تم؟" ان کے لہجے میں سختی در آئی۔ وہ کون تھا اور ان کے گھر میں کیوں آیا تھا؟

"میں محراب ہوں... محراب قریشی..." اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔

”راہب قریشی کا بیٹا۔“ ہوائیں اس کے تعارف پر ایک لمحے کو ساکت ہوئی تھیں۔ مگر انسانی وجود پر اس کے الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

”کیسے آنا ہوا؟“ وہ بغیر کسی تمہید کے اصل مدعے پر آئیں۔ میرم نے پر سوچ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ کیا ’یہ شخص‘ واقعی کرایہ دار تھا؟

”آپ نے اوپر والا مکان کرایے پر دینے کے لیے خالی کر رکھا ہے۔ منشی صاحب کے توسط سے اسی سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔ آواز میں پختگی تھی۔ البتہ چہرے کے تاثرات جامد تھے۔

”تو پھر یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہم نے عورت کو کرایے پر مکان دینے کو کہا تھا کسی مرد کو نہیں۔“ شازیہ کی وضاحت پر وہ کچھ بولتے بولتے رک گیا۔

”منشی صاحب نے بتایا تھا کہ آپ مجھے مکان نہیں دیں گی مگر میں ایک دفعہ آپ سے بنفس نفیس بات کرنا چاہتا تھا۔“ اس کا لہجہ ملتجی تھا۔ میرم نے اس کا اضطراب بغور دیکھا تھا۔

”میری طرف سے انکار ہے۔ بہتر ہوگا تم کوئی اور مکان ڈھونڈو۔“ ان کا لہجہ قطعیت آمیز تھا۔ اتنے واضح اور دوٹوک جواب پر بھی اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

”میں زیادہ کرایہ دینے کو تیار ہوں... بیس ہزار؟ پچیس ہزار؟“ میرم ریحام کے ہونٹ بھینچ گئے۔ اس نے ان پر سے نظریں ہٹا لیں۔ کیا وہ انہیں لالچ دے رہا تھا؟

"گارنٹی دینے کو تیار ہو؟" شازیہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"کیسی گارنٹی؟" استفسار ہوا۔

"یہی کہ تمہاری بدولت ہمیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ تم ہمارے لیے خطرہ ثابت نہیں ہوگے؟" انہوں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"مجھ جیسے بے ضرر انسان سے آپ کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟" اس نے ناسمجھی سے شازیہ کی جانب دیکھا۔ وہ استہزائیہ مسکرائیں۔

"مرد جیسا بھی ہو، اسے بے ضرر سمجھنا بے وقوفی ہے۔ اس گھر میں میری جوان بیٹی رہتی ہے۔ ایک چھوٹا بیٹا بھی ہے۔ پھر میں کیسے ایک اجنبی پر بھروسہ کرلوں؟" انہوں نے اپنا خدشہ پیش کیا۔ وہ اپنی بات پر حق بجانب تھیں۔ وہ ماں تھیں اور خصوصاً بیٹی کی ماں تھیں۔ ضرورتیں ایک طرف لیکن مجبوری میں کمائے پیسوں سے عزت نہیں خریدی جاسکتی۔

"آپ کا خدشہ جائز ہے مگر میں بہ خوشی آپ کے گھر میں رہنے نہیں آیا۔ چار دن مجبوری کے کٹ جائیں تو آپکا اور میرا، دونوں کا فائدہ ہے۔ یقین جانیں آپ کو کبھی بھی میری وجہ سے پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" وہ اپنی باتوں سے انہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اچھا؟(انہوں نے اسے پر سوچ نگاہوں سے دیکھا) بالفرض ہم نے تمہیں کمرہ دے دیا اور کل تم کسی مصیبت میں گھر گئے اور تمہاری وجہ سے کسی نے ہم پر انگلی اٹھائی یا ہمارا کوئی نقصان ہوا۔ تو؟“ وہ چند لمحات بعد اس کے الفاظ کے بندھے مضبوط حصار سے نکلنے کے بعد گویا ہوئی تھیں۔

”تو جو آپ کا فیصلہ ہو گا مجھے منظور ہو گا۔ میں کسی بھی حال میں آپکی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ اور ایسی کسی بھی صورت میں اپنا راستہ الگ کر لوں گا۔ لیکن مجھے آپ کا اعتماد چاہیے اور اگر آپ کا اعتماد میری باتوں سے نہیں بن سکتا تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔“ اس کے لہجے میں صداقت تھی۔ شازیہ کے چہرے پر متاثر کن تاثرات ابھرے۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

”زبان دینا آسان ہوتا ہے، عمل کرنا مشکل۔“ شازیہ کی آواز میں سختی کے ساتھ تلخی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ وہ اتنا بضد کیوں تھا؟

”بس ایک موقع دے دیں۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔“ اس کا لہجہ ملتمسانہ ہو گیا۔ شازیہ نے چند ثانیے ذہن میں جمع تفریق کی۔ ان چند لمحوں میں محراب نے سانس روکے رکھی تھی۔

"اچھے گھرانے کے لگتے ہو۔رسک لیا جا سکتا ہے مگر..."وہ مدھم سا مسکرائی تھیں۔محراب نے کب کی رکی ہوئی سانس خارج کی۔میرم نے گھور کر ماں کو دیکھا۔

"آخری فیصلہ میری بیٹی کا ہوگا۔"انہوں نے سہولت سے کہتے ہوئے میرم کی جانب اشارہ کیا۔وہ ایک دم گڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔دل و دماغ نے اماں کی بات کو پروسیس کیا اور بات سمجھ میں آتے ہی وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

یوں جیسے وہ کہے گی انکار ہے سو مطلب انکار ہے۔'آہ!میری معصوم ماں۔'وہ پیچ و تاب کھاتی رہ گئی۔ماں نے سارا ملبہ اس کے سر ڈال کر جیسے اس پر احسان عظیم کیا تھا۔

"آپ کیا کہتی ہیں؟"محراب نے نظریں اٹھا کر میرم کی جانب دیکھا۔اسی پل میرم نے بھی اسے دیکھا تھا۔دونوں کی نظروں کا زوردار تصادم ہوا۔سرمئی آنکھیں بھوری آنکھوں سے ٹکرائیں تو ایک لمحے کے لیے وقت کی رفتار رک گئی...چرخِ فلک ٹھہر سا گیا۔

وہ دریائے راوی کا باسی....وہ صحرا کی خاک

وہ داتا کی نگری کا راہی...وہ قافلوں کی دھول

وہ لاہور کے ہجوم میں تنہا...وہ چولستان کی وسعتوں میں مکمل

کون کہتا ہے کہ آنکھیں وار نہیں کرتیں؟ یہ تو خنجر ہیں۔اپنی کرنی پر آئیں تو دل چاک کر جائیں۔اسی لمے، ٹھیک اسی لمحے محراب قریشی کی آنکھوں میں میرم ریحام کا عکس ہمیشہ کے لیے ساکت ہوتا چلا گیا۔

"جی؟ میں... میں کیا کہوں؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے شازیہ کو دیکھا جو رخ موڑے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ان کی آنکھوں میں آمادگی تھی۔رضا کی جھلک دیکھ کر میرم نے گہری سانس لی۔فیصلہ ہو چکا تھا، مہر لگانا باقی تھی۔

"جو آپ کو بہتر لگے۔مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ پلٹ کر کچن میں چلی گئی۔سرمئی آنکھیں ایک بار پھر سے جھک گئی تھیں۔شازیہ نے گہری سانس لی۔اس وقت ان کے ذہن کے دریچے پر لوگوں کی باتیں نہیں تھیں بلکہ وہ مجبوریاں، ضرورتیں اور پریشانیاں تھیں جن کا بوجھ وہ ماں اور بیٹی تنہا اٹھا رہی تھیں۔ان کی دوائیوں کا خرچہ، فیضان کی پڑھائی، گھر کا راشن، بجلی گیس کے بل۔یہ سب بھرنے کے لیے لوگوں کی زبانیں کافی نہیں تھیں۔

ہمارے معاشرے کا یہی المیہ ہے، وہ تنہا عورت کو جینے کا مکمل حق نہیں دیتا۔اس سماج کے لوگوں کے نزدیک عورت کما رہی ہے تو آوارہ ہے اور اگر بھوک سے مر جائے تو نصیب۔انہیں احساس ہونے میں چند لمحے لگے تھے کہ وہ لوگوں کے ڈر سے اپنا ذریعۂ معاش

کاٹ نہیں سکتیں۔ میرم ٹھیک کہتی تھی لوگوں کا بس چلے تو وہ ہمارے حلق سے نوالے کھینچ لیں۔

☆...☆...☆

کچھ دیر بعد وہ دونوں چھت پر کھڑے تھے۔ کرایے کے اصول و شرائط طے پا چکی تھیں اور شازیہ اب اسے مکان دکھا رہی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی مستطیل چھت کے بائیں جانب ایک کشادہ سا کمرہ اور اس کے ساتھ متصل باتھ روم تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی چھوٹا سا کچن بھی موجود تھا۔

''اس مہینے کا کرایہ ایڈوانس دینا ہوگا۔'' وہ کچن کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ محراب نے سیدھ میں لگی کچن کی کھڑکی تھوڑی پس و پیش کے ساتھ کھولی۔ بادِ نسیم کا ٹھنڈا جھونکا اندر آیا تو فضا مہک اٹھی۔ اس نے ہاتھ جھاڑے اور باہر جھانکا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ گلی کی جانب کھلتے تھے۔ سامنے ہی کسی گھر کی خالی چھت تھی۔ نیچے گلی میں بچے اس وقت بارش میں بھیگنے کے بعد اچھل کود میں مصروف تھے۔

''صبح ہوتے ہی میں کرایہ دے دوں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔'' اس نے ایک نظر کچن میں دوڑائی۔ وہاں پرانے سے چولہے کے ساتھ ضرورت کے چند برتن بھی موجود تھے۔ وہ سب اس کے لیے گزارے لائق تھا۔

"تنہابندے کے لیے میں نے ضرورت کی چیزیں رکھ دی ہیں۔ ہر چیز کا خیال رکھنا۔ یاد رہے ٹوٹ پھوٹ یا خراب ہونے کی صورت میں ہرجانہ دینا ہوگا۔" ان کی بات ذو معنی تھی۔

محراب نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

"پہلا تجربہ ہے میرا ورنہ اتنے خدشات کبھی لاحق نہ ہوتے۔" وہ کچن سے نکلتے ہوئے بولیں۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔" وہ بھی باہر نکل آیا۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ گیلی مٹی کی خوشبو، خنک ہوا کے نرم جھونکے... یہ سب مل کر فضا میں سکون بکھیر رہے تھے۔

اچانک محراب چونک کر سیڑھیوں کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کی چھٹی حس نے فوراً اسے کسی کی آمد کی خبر دی تھی۔ اگلے ہی لمحے اسے ہاتھ میں ٹرے تھامے میرم ریحام اوپر آتی نظر آئی۔ اس کی نظریں لاشعوری طور پر زاویہ بدل گئیں۔

"تم چائے پیو اور آرام کرو۔ آج رات کا کھانا ہماری طرف سے ہے۔" میرم نے ٹرے کمرے میں لے جا کر میز پر رکھ دی۔ شازیہ اور وہ بھی اندر داخل ہو چکے تھے۔

"اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں خالہ۔" اس نے مدھم لہجے میں انکار کرنا چاہا۔

”کل سے اپنا بندوبست خود کر لینا۔“ انہوں نے بات وہیں ختم کر دی۔ محراب نے مسکرا کر تعظیم میں سر ہلایا۔ جبکہ شازیہ کے ساتھ کھڑی میرم نے اپنی ماں کی فراخدلی پر نفی میں سر ہلایا۔

”میں چلتی ہوں۔“ وہ میرم کو اشارہ کرتی ہوئیں سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔ مگر میرم وہیں کھڑی رہی۔ محراب اپنے سفری بیگ کو بیڈ پر رکھ کر کھول رہا تھا۔

”چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ وہ چونک کر پلٹا۔ میرم ابھی تک دروازے میں ایستادہ تھی۔ وہ سر جھٹک کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور میز پر رکھی ٹرے میں سے ٹھنڈی ہوتی چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگایا۔ نان خطائیاں مکمل طور پر نظر انداز ہوئی تھیں۔ چائے پیتے اس نے کن انکھیوں سے میرم کو دیکھا۔ وہ اس کی موجودگی سے واضح طور پر ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ وہ ابھی تک وہاں کیوں کھڑی تھی؟

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ اس کی آواز سنجیدگی سے لبریز تھی۔

”جی؟“ وہ ایک لمحے کے لیے بھونچکارہ گیا۔ کیا واقعی اسے اس انداز میں مخاطب کیا گیا تھا؟

”میں سن رہا ہوں۔“

”میں تمہارے آنے کا مقصد تو نہیں جانتی مگر اتنا وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ تم یہاں بے مقصد نہیں آئے۔“ محراب نے دونوں ابرو ستائشی انداز میں اوپر کو اٹھائے۔

"خوش فہمی اور غلط فہمی کا علاج بڑے سے بڑے طبیب کے پاس بھی نہیں ہے۔" اس کی آواز میں ہلکا سا طنز تھا۔

"میری بات کو غلط فہمی کا رنگ مت دو۔ میری ماں بہت رحمدل ہی۔ لیکن میں ہر گز نہیں ہوں۔" میرم کی آنکھوں میں شعلے بھڑک اٹھے۔

"میں تمہیں برباد کردوں گی اگر تم نے ہمیں برباد کرنے کا سوچا بھی تو۔" وہ انگلی اٹھائے بولتی جارہی تھی اور محراب قریشی ساکن سا اس کے الفاظ کی سفاکی سہہ رہا تھا۔ یہ عورت کیا تھی؟

"تمہارا گزارا یہاں ویسے بھی ممکن نہیں۔ بہتر ہے جتنا جلدی ہو سکے، چلتے بنو۔" وہ پہلے ہی دن اسے گھر سے نکل جانے کو کہہ رہی تھی۔ محراب کی کنپٹی کی نس شدید اشتعال سے پھڑکنے لگی۔

"آپ۔!" وہ ضبط کرتے گہری سانس لے کر رہ گیا۔ سارا غصہ، سارا اشتعال اس ایک لمبی سانس نے گویا نگل لیا تھا۔

"کیا؟" وہ رکی۔

"مجھے 'تم' کا طرزِ تخاطب نہیں پسند لہذا آپ کہہ کر بات کریں۔" وہ دانستہ بات کا رُخ بدل گیا۔

''اگر نہ کہوں تو؟ کیا کر لوگے؟'' وہ اسے کپ ٹرے میں رکھ کر ٹرے اٹھاتے دیکھ رہی تھی۔

''تو جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ میرم خاموش نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ اس نے ٹرے میرم کی جانب بڑھائی۔ وہ اسے پکڑنے کی سکت خود میں نہ رکھ سکی تھی۔ مقابل نے اس کے تمام خدشوں اور وسوسوں کو پل میں بکھیر دیا تھا۔

''چائے کے لیے شکریہ! مگر میں چائے نہیں پیتا۔ اور تیز نمک والی چائے تو ہرگز نہیں۔'' ہونٹوں کے خم میں بے نام سی مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔ میرم کا سارا فشارِ خون چہرے پر سمٹ آیا۔ پلکیں خجالت اور شرمندگی کے احساس سے لرز کر عارضوں پر جھک گئیں۔ دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''معذ.... معذرت!'' سبکی کے احساس تلے دبی وہ اپنے لہجے کی لڑکھڑاہٹ پہ قابو نہ پا سکی۔ محراب کے گرفت سے ٹرے باقاعدہ چھیننے والے انداز میں جھپٹ کر وہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

''یااللہ! اس شخص کے سامنے کیوں ذلیل کروا دیا؟'' وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی تھی۔

''اگلی دفعہ چائے میں زہر نہ دیا تو میرا نام میرم نہیں۔'' غصے اور جھنجھلاہٹ میں بڑبڑاتی ہوئی وہ سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ ہواؤں نے اسے دیکھ کر ہنس کر سر جھٹکا تھا۔ گویا اس کی زبان کی گوہر افشانیوں پر تاسف کا اظہار کیا ہو۔

اب بتاؤ میرم میڈم؟ کہاں گئے تمہاری زبان کے چلتے جوہر؟

☆...☆...☆

"امی میں آپ سے آخری دفعہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ کہاں گئی تھیں؟" وہ کمرے کے دروازے کے ساتھ پشت ٹکائے کھڑی تھی۔ آنکھوں میں گہرا حزن چھپا رکھا تھا۔

"بتا تو رہی ہوں... آس پڑوس میں ہی گئی تھی۔ تم کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہو؟" انہوں نے بیڈ پر پھیلے کپڑوں پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ وہ تمام نئے مگر ان سلے کپڑے تھے۔ درمیان میں دھاگوں کا ڈبہ رکھا ہوا تھا جس میں سے وہ کپڑوں سے میل کھاتا دھاگہ نکالتیں اور ایک طرف رکھتی جاتیں۔ ان کے ہاتھ معمول کے مطابق کام کر رہے تھے۔

"آپ بغیر بتائے گئی تھیں اور فون بھی گھر چھوڑ گئیں۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ مجھے ٹینشن ہونے لگتی ہے۔" اس نے دکھ سے کہا۔ آواز میں دباد با غصہ شامل تھا۔ شازیہ نے نفی میں سر ہلاتے اس کی پریشان صورت دیکھی۔ کہاں وہ ناراض ہوئے بیٹھی تھی اور کہاں اب ان کے سامنے کھڑی سوال وجواب کر رہی تھی۔ انہوں نے تھک کر گہری سانس لی۔

"بڑی بی کی طرف گئی تھی۔" انہوں نے آہستہ آواز میں کہتے ہوئے گویا کسی جرم کا اعتراف کیا تھا۔ میرم کا چہرہ یک دم سپاٹ ہوا۔ حیرت کے مارے لب وا ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیروں ملال اترنے لگا تھا۔

"آپ واقعی گئی تھیں؟" وہ چند ثانیے بعد بولنے کے قابل ہوئی تو آواز بھاری ہو چکی تھی۔

شازیہ نے پہلے سے جھکا ہوا سر ہلا دیا۔

"اوہ خدایا! میری ماں اپنی رشتہ داریاں نبھا رہی ہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے گہرا طنز کیا تھا۔

"ان کی طبیعت خراب تھی۔ میں صرف ان کی عیادت کے لیے گئی تھی۔" شازیہ نے صفائی دینا چاہی۔

"ان کی اولاد نے بڑی بی کے جنازے پر بھی آپ کی شرکت ممنوع قرار دی ہوئی ہے اور آپ ان کے گھر عیادت کو چلی گئیں۔ ایک لمحے کے لیے بھی آپ کو ہمارا خیال نہیں آیا؟" غصے اور رنج سے اس کا لہجہ کانپ اٹھا تھا۔ شازیہ نے ہاتھ میں تھامے کپڑے رکھ کر خفگی بھرے چہرے سے اس کی جانب دیکھا۔

"میرم!" انہوں نے سختی سے ٹوکا۔

"وہ ہمارے اپنے ہیں اور اپنوں سے منہ نہیں موڑا جاتا۔" ان کی بات پر میرم نے سرخ آنکھوں کے ساتھ سر دائیں سے بائیں ہلایا۔

"وہ اپنے نہیں ہیں امی۔ اپنے ایسے نہیں ہوتے۔ وہ اپنوں کو مرتا نہیں چھوڑ دیتے۔" اس کا لہجہ نفرت آمیز تھا۔

"وہ زمین کو اپنی ملکیت سمجھ کر اس پر اکڑ کر چلتے ہیں، صرف اس لیے کہ ان کے پاس چند پیسے ہیں جو ہمارے پاس نہیں۔ رشتے داریاں پیسوں اور مفاد کی محتاج تو نہیں ہوتیں امی، پھر وہ کیوں ہیں ایسے؟ کیا فائدہ اس دولت کا جو آپ کو اپنوں سے دور کر دے؟" وہ بولی تو لہجہ متأسفانہ تھا۔

"ایسے رشتہ داروں سے منہ نہیں موڑا جاتا بلکہ قطع تعلقی کی جاتی ہے۔" وہ تڑپ کر رہ گئی۔ لوگ آخر ہمارے زخموں کو ادھیڑنے سے باز کیوں نہیں آتے؟

"قطع تعلقی گناہ ہے۔ کچھ تو رشتوں کے تقدس کا لحاظ کرو۔" شازیہ نے نرمی سے سمجھانا چاہا تھا، جب وہ اپنا ضبط کھوتی تیزی سے ان کے قریب ہوئی۔

"تقدس... کون سا تقدس، امی؟ ان لوگوں نے تو میرے باپ کی مرگ کی بھی لاج نہیں رکھی تھی۔ میرے باپ کی میت پر ان کے خاندان کی واحد عورت کے گھر والے موجود نہیں تھے۔" آواز بھرّا گئی۔ آنکھوں سے آنسو باہر نکلنے کو بے تاب ہو چلے۔

"ان کے لیے میرے باپ کی سانسیں بوجھ تھیں۔ جنہیں انہوں نے بیٹوں سے بڑھ کر چاہا، ان کے لیے اپنی عزت تک داؤ پر لگا دی... وہ ان کے جنازے میں کندھا دینے تک نہیں آئے۔ میرے باپ کو غیروں نے کندھا دیا تھا امی۔ آپ کیوں نہیں سمجھ پاتیں؟" اس کی

آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ دو آنسو رخساروں پر بہتے چلے گئے۔ دل رکنے لگا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح آجا رہی تھی۔

"رشتے میں وہ میری پھوپھو لگتی ہیں مگر مجھے اور فیضی کو دیکھ کر یوں تنفر سے منہ موڑ جاتی ہیں جیسے ہم اچھوت ہوں۔ اور آپ کو ہم سے توقع ہے قربت داری نبھانے کی؟ ان لوگوں نے جو خلیج پیدا کی تھی نا، وہ کبھی پُر نہیں ہو سکتی۔ یہ ٹوٹی ہوئی رشتہ داریاں دوبارہ گانٹھی نہیں جا سکتیں۔" وہ سسک رہی تھی۔ اور شازیہ کو پہلی مرتبہ اپنی نادانی پر افسوس ہوا۔

"آپ کو نہیں جانا چاہیے تھا امی۔ آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔ آپ کو مجھے سمجھنا چاہیے تھا۔" وہ نم آلود آواز میں کہہ رہی تھی۔ شازیہ نے اس کی تڑپ اور کرب میں ڈوبے لہجے پر اپنے آنسو دل میں اتارے۔

"میں نے کچھ نہیں کیا بیٹے۔ میں بتاتی تو تمہیں تکلیف ہوتی۔" انہوں نے اسے پچکارنا چاہا مگر وہ ہنوز گہرے سانس بھرتی نفی میں سر ہلائے جا رہی تھی۔

"تکلیف؟ اذیت؟ غم؟ کب مجھے نہیں ملا؟.... چند گھنٹے امی... اور ان چند گھنٹوں میں 'میں پل پل مری ہوں۔ آپ نہیں تھی تو لگا آپ چلی گئی ہیں۔ یہ خیال ہی سوہانِ روح تھا کہ..."

"میرم۔" وہ ایک دم ٹھہر گئی۔ لب بھینچ لیے۔ آنکھیں کرب سے بند ہو گئیں۔ یہ وہ کیا کہہ گئی تھی؟

Clubb of Quality Content!

”تمہیں پھر سے پینک اٹیک آیا تھا؟“ شازیہ کی لرزتی آواز نے اس کی رہی سہی ہمت بھی ختم کردی تھی۔ وہ کٹی ہوئی ڈال کی ان کے قریب بیڈ پر ڈھے گئی۔

”میری بیٹی... میری پیاری بیٹی۔“ شازیہ نے سب کچھ ایک طرف رکھ کر اسے خود میں سمو لیا۔

”مت روتم۔“ ان کی آواز رندھ گئی۔ میرم کی ہچکیاں کمرے میں گونجنے لگیں۔

”تم تو میری بہادر بیٹی ہو نا؟“ انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے میرم کا چہرہ اوپر کیا۔ مگر بھوری آنکھوں میں رقم تحریر نے انہیں زندہ درگور کردیا۔ آج پہلی بار انہیں واقعی احساس ہوا تھا کہ ماں باپ کے چند غلط فیصلے اولاد کی پوری زندگی کو تباہ کردیتے ہیں۔

انہوں نے جھریوں زدہ چہرے پر بہتے آنسوؤں کے ساتھ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ایک لمس، فقط ایک لمس... اور پوری دنیا جیسے میرم ریحام کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ اور پھر ماں کی شفقت کے سامنے تو پوری دنیا کی آسائشیں صفر ہیں۔

”میری بچی! کیوں اتنا ڈرتی ہو؟ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ زندہ ہوں۔ تمہارے سر پر سلامت ہوں۔“ انہوں نے اسے خود سے لپٹائے رکھا۔ وہ دیوانہ وار اس کا چہرہ چھو رہی تھیں گویا اپنی موجودگی کی یقین دہانی کروانا چاہتی ہوں۔

"امی؟" چند لمحوں بعد خاموشی کی نظر ہوئی فضا میں میرم کی زکام زدہ آواز گونجی تھی۔

"ہمم۔" وہ آنکھیں موندے اس کے سر پر اپنا چہرہ ٹکائے ہوئے تھیں۔

"میں نے آپ لوگوں کو بہت تکلیف پہنچائی ہے نا؟" وہ ان کے سینے سے لگی پوچھ رہی تھی۔ شازیہ نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

"پاگل ہو گئی ہو؟ ماں کو بھی کوئی تکلیف دے سکتا ہے؟ پھر تم تو میری دعاؤں کا ثمر ہو۔" انہوں نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اذیت سے مسکرائی تھی۔ اور ایک ماں کا دل کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

"دعا تو ہمیشہ قبول ہوتی ہے نا؟" شازیہ نے ہولے سے سر ہلایا۔

"پھر آپ کی دعائیں مجھے کیوں نہیں بچا پائیں؟" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔

"کس سے؟ کس سے بچانا تھا تمہیں؟" وہ گھبرا کر بولیں۔ دل عجیب لے پر دھڑکا تھا۔

"اس زندگی کی اذیت سے... ان فیصلوں سے جن پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔" اس کی آواز بوجھل تھی، صدیوں کی تکان لیے ہوئے۔ سیاہ گیسو پھسل کر اس کا چہرہ ڈھانپ گئے۔ میرم ریحام پر نعمت ہوئی تھی جو وہ اپنے آنسو ماں کے سامنے عیاں کرنے سے بچ گئی۔

اور ماں؟ وہ لاجواب رہ گئیں۔ ان کے دل پر جیسے کسی نے الٹی برچھی چلائی تھی۔ خون آنسوؤں کی صورت بھل بھل بہنے لگا تھا۔

"امی... آپ مت جانا کبھی... پلیز۔" شازیہ نے اسے سیپارہ ہوتے دیکھ کر اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ وہ ان کی باہوں میں بھر بھری ریت کی مانند بکھر گئی۔ ماں کی آغوش ہمیشہ کی طرح آج بھی میرم ریحام کے لیے ڈھال بن گئی تھی۔

☆...☆...☆

مغرب کی اذان سے قبل چھت کا منظر کسی غیر رسمی انٹرویو کا سماں پیش کر رہا تھا۔ میزوں اور کرسیوں کے بجائے وہاں ایک پرانی لکڑی کی کرسی پڑی تھی جس پر اس وقت فیضان یوسف براجمان تھا۔ وہ سیاہ اسکول پینٹ پر نیلی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ آستینیں کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں اور بال پیشانی پر الجھے بکھرے تھے۔ اس کی گہری نگاہیں سامنے دیوار پر کہنی ٹکائے کھڑے محراب قریشی کے اندر تک اتر رہی تھیں۔

وہ پہلی سہ ماہی کے امتحانات کی تیاری کے لیے اسکول سے سیدھا اکیڈمی گیا تھا۔ واپسی پر اسے میرم سے نئے کرایے دار کی آمد کی خبر ملی تھی۔ اور اب 'دی اینکر پرسن، فیضی صاحب' بذاتِ خود محراب قریشی کا انٹرویو لینے آ پہنچے تھے۔

"جو کہنا ہے جلدی کہہ دو بھئی، میری نیند حرام کر کے کیوں مجھے حریص نگاہوں سے گھور رہے ہو؟" محراب نے دائیں ہاتھ سے تھوڑی کھجائی۔

"اطمینان رکھو۔نہ تم کوئی نازک حسینہ ہو نہ ہی میں کوئی تماش بین ہیرو،جو تمہارے نظارے کر کے اپنا دل بہلاؤں گا۔"اس کے بے تکے اور بے باک جواب پر محراب کے کانوں سے جیسے دھواں نکلنے لگا تھا۔یہ اس سے آدھی عمر کا بچہ آخر کیا چیز تھا؟

"نام کیا ہے تمہارا؟"اب کہ باقاعدہ انٹرویو کا آغاز ہوا تھا۔محراب ایک دم سیدھا ہوا۔

"محراب قریشی۔"فیضان نے آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں۔محراب کے ماتھے پر دو بل مزید گہرے ہوئے۔

"باپ کا نام؟"

"راہب قریشی۔"بے نیازی دیدنی تھی۔فیضان نے سر ہلایا۔بغور فیضان کو دیکھتے اچانک ہی محراب قریشی کی شرارتی رگ پھڑک اٹھی۔

"کتنا پڑھے ہو؟"وہ واقعی کسی ماہر میزبان سے کم نہ لگ رہا تھا۔

"میٹرک فیل ہوں۔"جواب فٹ سے آیا تھا۔

"کرتے کیا ہو؟"

"بے روزگار ہوں"سرمئی آنکھوں کی چکا چوند دوگنی ہوگئی۔فیضان نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"تو کھاتے کیا ہو جب کماتے ہی نہیں؟"محراب کے چہرے پر مسکینیت طاری ہوئی۔

”من و سلویٰ!“

”شادی شدہ ہو؟“ سب سے اہم سوال۔

”شدید کنوارا ہوں!“ سخت تلملاتا ہوا جواب موصول ہوا تھا۔ آخر اتنی ذاتیات میں ناک گھسانے کی کیا ضرورت ہے فیضی صاحب؟

”مستقبل کا کیا منصوبہ ہے؟“

”تمہارے جانے کے بعد بارہ گھنٹے کی نیند پوری کرنا۔“ فیضان کی ہونق بنی شکل دیکھ کر اس نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

”ڈھنگ کا جواب دینا آتا ہے؟“ وہ سیخ پا ہوا۔ لہجہ تیز ضرور تھا مگر اس میں بدتمیزی کا عنصر موجود نہیں تھا۔

”بے ڈھنگے بندوں کو نہیں دیتا۔“ تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ فیضان ایک دم کھول اٹھا۔ غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اس نے ٹانگ سے ٹانگ اتاری اور قدرے آگے جھک کر اپنے انداز و اطوار میں خوف پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”تم جانتے ہو میں کون ہوں؟“ لہجہ سنسنی خیز تھا۔

”اونہوں۔“ محراب کا سر بے ساختہ نفی میں دائیں سے بائیں ہلا۔ البتہ شوخ اور محفوظ کن مسکراہٹ اس کے لبوں پر مچلنے کو بے تاب تھی۔

Clubb of Quality Content!

"میں اس گھر کا اکلوتا مرد ہوں" اس نے انگشتِ شہادت سے اپنے سینے پر ٹھوکا دیا۔ محراب نے اس کے تفاخر سے کہنے پر اسے سرتا پیر بغور دیکھا۔ اونہوں! پل بھر میں سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا تھا۔

"یہ ڈیڑھ فٹیا اس گھر کا اکلوتا مرد ہے؟" وہ دل ہی دل میں کہہ دیتا تو ٹھیک تھا لیکن اس کی آواز فیضان تک جا پہنچی تھی۔ کب؟ کیسے؟ واللہ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی۔ فیضان یوسف عرف فیضی کی شکل دیکھ کر اس کا چہرہ قہقہہ ضبط کرنے کے چکر میں سرخ ہو گیا۔

"تم ہنس رہے ہو؟" وہ شاکڈ رہ گیا۔

"نہیں... میں تمہاری پرسنیلٹی سے مغلوب ہو رہا ہوں۔" محراب نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سیرنڈر کیا۔ فیضی کے چہرے کے تاثرات تھوڑے معتدل ہوئے۔

"ہونا بھی چاہیے... کیونکہ اس گھر میں میرا حکم چلتا ہے۔ پورے گلِ ریگاں پر میرا راج ہے۔ گلی کا بچہ بچہ مجھے فیضی بھائی کے نام سے جانتا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ میری دہشت سے ڈرو۔" مصنوعی بھاری آواز نے اس کے رعب و دبدبے میں مزید جان ڈال دی تھی۔

"اور تمہیں چاہیے کہ چپ چاپ نیچے جا کر پیپر کی تیاری کرو۔" دفعتاً بائیں جانب سے آنے والی آواز پر فیضی بھائی سپرنگ لگے کھلونے کی طرح اچھل کر کھڑے ہوئے۔ 'ٹھس' کی آواز کے ساتھ غبارے میں سے ساری ہوا نکل گئی تھی۔

"جج...جی...آپی؟" وہ میرم کی موجودگی پاکر ہکلا کر رہ گیا۔پیشانی پر عرق کے قطرے نمودار ہوئے تھے۔

"انٹرویو مکمل ہو گیا ہو تو نیچے جاؤ۔" وہ جھڑک کر بولی۔فیضان نے دریدہ نگاہوں سے محراب کو دیکھا۔وہ دونوں لب دبائے، بازو سینے پر باندھے، شریف بچے کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔وہ ہنس نہیں رہا تھا بلکہ ہنسی پر قابو پانے کی جدوجہد میں ہلکان ہو رہا تھا۔سفید رنگت میں گھلتی سرخیاں اسے جاذب نظر بنا رہی تھیں۔

"مطلب منہ پر فٹے منہ!" بڑبڑاتا ہوا فیضی شرٹ کے کالر سے نادیدہ گرد جھاڑتا نیچے کی جانب بڑھا تھا۔

"یہ ناانصافی ہے آپی، میں اکیڈمی سے تیاری کر کے آیا تھا۔"میرم کے قریب پہنچ کر اس کا احتجاج بلند ہوا۔میرم نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"بہ مشکل تین گھنٹے میں کون سے منتھلی ٹیسٹ کی تیاری ہوتی ہے بتانا ذرا؟" وہ اپنا دامن بچاتے ہوئے اس پر حاوی ہوئی تھی۔

"دیکھ لوں گا میں آپ کو...اپنا کام تو نکلوا لیا آپ نے۔" وہ آنکھوں میں پنپتے غصے کو دباتا تن فن کرتا نیچے چلا گیا۔

''فیضان کی غلطی کو نظرانداز کرنا۔ اسے بس یونہی اینکر پرسن بننے کا شوق ہے۔ شکریہ!'' وہ سنجیدگی سے کہتی، جیسے آئی تھی ویسے ہی ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہوگئی۔ کچھ دیر پہلے گزری قیامت کا شائبہ تک اس کے انداز سے عیاں نہ تھا۔

''انٹرسٹنگ۔'' گہری سانس بھرتے ہوئے محراب نے سر کو ذرا سا خم دیا۔ مطلب یہاں ایک کے ساتھ ایک دو نہیں... پورے گیارہ تھے۔ ایک فولادی لہجے والی بڑی بہن تھی تو دوسری طرف اینکر پرسن نما چھوٹی مخلوق، اور ان دونوں کے درمیان محراب قریشی خوب پسنے والا تھا۔

''چلو...'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

''دیکھتے ہیں یہ گیارہ کیسے سنبھالتے ہیں ایک آدمی کو۔'' وہ بے اختیار مسکرایا تھا۔

☆...☆...☆

ڈھلتی شام میں محراب قریشی کو وہیں چھوڑ کر اگر نیچے کا رخ کیا جائے تو کچن سے اٹھتی بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو نے پورے گھر کو معطر کر رکھا تھا۔ کھانے کی بھینی بھینی مہک کھڑکیوں سے سفر کرتی اس کے کمرے تک بھی آن پہنچی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اسٹڈی ٹیبل پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آج کا پورا دن حشر تھا۔ مگر وہ ایک بار پھر اسے پار کر آئی

تھی۔اب تو ایسے دن اس کی عادت بن گئے تھے۔اس نے تلخی سے مسکرا کر سر جھٹکا اور سامنے میز پر نگاہ دوڑائی۔بچوں کے ٹیسٹ بکھرے پڑے تھے۔وہ سرخ بال پوائنٹ سے غلطیوں کے گرد دائرے بناتی جا رہی تھی۔بائیں ہاتھ کی رنگ فنگر میں پہنی انگوٹھی کا نگ پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔

"بہت بے ایمان ہیں آپ باجی۔" فیضان باتھ روم سے برآمد ہوا تھا۔سفید شلوار قمیص میں ملبوس، وہ دائیں ہاتھ میں یونیفارم تھامے ہوئے تھا۔

"میں نے کیا کیا؟" اس نے رخ موڑے بنا پوچھا۔واللہ معصومیت کی تو انتہا تھی۔

"پہلے خود مجھے اس ایجنڈے کا انٹرویو لینے بھیجا اور پھر آ کر مجھے ہی دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دیا۔" اس نے پوری قوت سے یونیفارم کونے میں رکھی ٹوکری میں اچھال دیا۔میرم اس کے ردِ عمل سے جز بز ہوئی۔

"دو گھنٹے گیم کھیلنے کی اجازت بھی دی تھی۔اگر یاد ہو تو؟" وہ بغیر ہتھی والی کرسی پر رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔فیضان منہ ہی منہ میں میرم کی شان میں قصیدے پڑھتا بیڈ پر جا بیٹھا۔

"کچھ معلوم ہوا؟" وہ متجسس ہو کر بولی۔

"کوئی سیدھا جواب نہیں دیا اس نے۔" فیضان نے اس کے تجسس کو مزید ہوا دی۔

"مطلب؟" میرم کی نظروں میں تیکھا پن اتر آیا۔

''مطلب یہ کہ وہ ایجنڈا... محراب قریشی کوئی عام آدمی نہیں ہے۔''اس نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

''تو کیا بہت خاص ہے کوئی؟''وہ فیضی معصوم پر چڑھ دوڑی۔فیضان نے آنکھیں گھماتے ہوئے ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور ایک نظر سائیڈ ٹیبل پر چارجنگ پر لگے موبائل پر ڈالی۔

''مجھے تو وہ مشکوک لگتا ہے۔آپ خود سوچیں،اتنے پوپٹ حلیے والا شخص آخر گلِ ریگاں میں آ کر کیوں رہے گا؟وہ بھی کرایے پر؟اس کا سامان دیکھ کر تو لگتا ہے کسی کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا ہے پھر وہ یہاں کیوں آیا؟''وہ سوال سے سوال جوڑتا چلا گیا۔میرم کے ابرو اوپر کو اٹھ گئے۔

''تو تمہیں انٹرویو لینے کس لیے بھیجا تھا؟جب سوال ہی مجھ سے کر رہے ہو۔''وہ خاصا چِڑ کر بولی۔

''بقول میری ماں کے،ان کی بیٹی سب سے دانا ہے۔تو جواب بھی آپ ہی کو معلوم ہونے چاہئیں۔''وہ تڑخ اٹھا۔میرم نے خفگی سے اسے گھورا۔بات اس کی دانائی پر آگئی تھی۔

''اس کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔''وہ بہت سوچ بچار کے بعد بولی۔بیڈ پر بیٹھا فیضان فوراً آلتی پالتی مار کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"پہلی...؟"اس نے ایک انگلی اٹھائی۔ میرم نے پر سوچ نگاہیں سامنے دیوار پر لگی بک شیلف پر جمادیں۔

"گھر والوں سے لڑائی یا اختلاف... ممکن ہے اس کا اپنے والدین یا کسی فیملی ممبر سے شدید جھگڑا ہوا ہو اور اس نے غصے یا ضد میں آکر گھر چھوڑ دیا ہو۔"اس کی بات قابل غور تھی۔

فیضان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"جی مگر ایسے میں بندہ دوست کا فلیٹ چنتا ہے جیسے اس دن والے ناول میں ہوا تھا جس میں ہیرو نے زبردستی شادی کروانے پر گھر چھوڑ دیا تھا۔ تو مسٹر مسٹیریس (Mr.Mysterious) لاہور سے بہاولپور کی خاک چھاننے کیوں آیا ہے؟"وہ اپنی جون میں کہہ گیا تھا۔

"تم میرے ناولز پڑھتے ہو؟"میرم نے شاکی انداز میں اسے دیکھا۔ فیضان نے زبان دانتوں تلے دبائی۔

"آ... نہیں آپی... میں.. میں تو بس ایسے ہی... کبھی کبھی... جنرل نالج کے لیے پڑھ لیتا ہوں۔ دوسری وجہ؟"وہ ایک دم بوکھلا گیا۔ میرم نے اسے تیز گھوری سے نوازا۔ تو طے ہوا، آج سے اسے اپنی کتابیں فیضی سے چھپا کر رکھنی ہونگی... کیونکہ بچہ بگڑتا جارہا تھا۔

"دوسری وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ وہ آزادی کی تلاش میں ہو۔ ویسے بھی اس عمر میں اکثر لڑکوں کو اپنے طور پر زندگی جینے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ان پر روک ٹوک نہ کرے۔ اپنی زندگی وہ اپنی مرضی سے زندگی گزار سکیں۔" فیضان اس کی بات پر متفق نظر آیا مگر میرم کی سوچ ایک جگہ اٹک گئی۔ آزادی اور مجبوری میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور وہ... محراب قریشی مجبور نظر آتا تھا۔

"پوائنٹ... لیکن بہاولپور جیسے کھنڈر شہر میں وہ آزادی کا حق استعمال کرنے کیوں آئے گا؟" دانشور بندے نے دوسری وجہ بھی مسترد کر دی تھی۔

"خبردار!" وہ فوراً بولی۔

"میرا بہاولپور کوئی کھنڈر شہر نہیں ہے۔ ایک مکمل زندگی بستی ہے یہاں۔" وہ خالص محبِ شہر کے طور پر احتجاجاً بولی تھی۔ بہاولپور سے اس کی محبت بے مثال تھی۔ **وہ بہاولپور کی سب سے بڑی مداح تھی۔**

"اوہ فو آپی۔ بہاولپور کی پرستش چھوڑیں۔ ہمیں تیسری وجہ پر غور کرنا چاہیے۔" فیضان نے سر جھٹکتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

"وہ کیا؟" میرم نے گہری سانس بھری۔ اب کہ فیضان عرف فیضی بھائی کو اپنا فلسفہ جھاڑنے کا موقع ملا تھا۔

”کوئی اہم مشن یا راز۔ وہ ننانوے فیصد یہاں کسی کا بھیجا ہوا بندہ لگتا ہے۔“ اس کی آواز پست ہو گئی۔

”کسی خاص مقصد سے آیا ہے وہ۔ مجھے تو وہ اسپائے لگتا ہے۔ را کا ایجنٹ... ؟ یا آئی ایس آئی کا؟ کمبخت کچھ بتاتا بھی تو نہیں ہے۔“ اس نے ریموٹ کی مدد سے ٹی وی آن کیا۔

”فیضی، کتنی مرتبہ کہا ہے انگریزی فلمیں کم دیکھا کرو۔“ میرم کی آواز سخت تھی۔

”میں کب دیکھتا ہوں؟“ اس کی معصومیت پر میرم نے دانت پیسے۔

”تو چار چار گھنٹے موبائل میں کیا دیکھتے رہتے ہو؟“ وہ اپنی نشست چھوڑ کر کھڑی ہوئی۔ چند لمحے فیضان منہ کھولے اپنے سچ کے عیاں ہونے پر گم صم رہا۔

”وہ تو میں انٹر ٹینمنٹ کے لیے دیکھ لیتا ہوں... کبھی کبھار۔“ اس نے ڈھٹائی سے اپنا جرم مانتے ہوئے بتیسی نکالی تھی۔

”ہونہہ کبھی کبھار؟“ وہ سر ہلاتی ہوئی اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

”ٹھیک ہے پھر آج کوئی موبائل نہیں ملے گا تمہیں۔“ اس سے پہلے فیضی کچھ سمجھ پاتا، اس نے چیل کی طرح جھپٹ کر موبائل چارجر سے جدا کیا تھا۔ فیضی حق دق رہ گیا۔

”یہ زیادتی ہے۔ میں نے آپ کو اتنی اہم باتیں بتائی ہیں اس کے بدلے میں۔“ وہ تقریباً رو دینے کو تھا۔

"بے فیض باتیں!" میرم نے شانِ بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ فیضان کو سخت قسم کا تاؤ آیا تھا۔

"سہی ہے، کوئی بات نہیں۔ فیضی معصوم کی آہ لگے گی۔ اور دیکھنا وہ محراب کوئی عام بندہ نہیں نکلے گا اور پھر آپ مجھے آکر کہیں گی، 'فیضی، میرے بھائی... تم سچ کہتے تھے۔ محراب قریشی عام آدمی نہیں ہے۔" اداکاری میں تو وہ آسکر جیتنے کا حقدار تھا۔

"اور ایسا کیونکر ہوگا؟" میرم نے اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

"اس کی خاموشی خطرناک ہے۔ جو لوگ کم بولتے ہیں نا، وہ یا تو بہت سادہ ہوتے ہیں یا بہت پیچیدہ۔" اس نے معنی خیز توقف کیا۔

"اور وہ یقیناً دوسرے نمبر والا ہے۔ لگی شرط؟" وہ ریموٹ والا ہاتھ فاتحانہ انداز میں میرم کی جانب بڑھا گیا۔

"ہاں لگی۔" اس نے بڑی سہولت سے فیضی کے ہاتھ سے ریموٹ بھی چھین لیا۔ اس بیچارے کی آنکھیں ابل باہر آئیں۔

"یا وحشت! کتنی دوغلی ہیں آپ۔" اس نے غصے سے پاس رکھا کشن اٹھا کر میرم کو مارا۔

"وہ تو میں ہوں۔" اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔ کشن اس سے ٹکرا کر زمین بوس ہو گیا۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

"اب تم زرا کتاب نکالو اور صبح ہونے والے پیپر کی تیاری کرو۔" وہ موبائل اور ریموٹ دونوں ہاتھوں میں لہراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"افف آپی۔اردو کے پیپر میں کون پڑھتا ہے؟" وہ جھنجھلا اٹھا۔چہرے سے ناراضی صاف جھلک رہی تھی۔

☆...☆...☆

صبح صادق کے ساتھ ہی سورج نے اپنی کرنوں سے گلِ ریگاں کو مہکا دیا تھا۔کل کی جھڑی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ہاتھ میں ناشتے کا شاپر موجود تھا۔بک واپس چڑھاتے اس نے کسی کی نگاہوں کی تپش محسوس کرتے پلٹ کر دیکھا۔سامنے برآمدے میں لگی میز کے ساتھ رکھی کرسیوں میں سے ایک پر فیضان بیٹھا تھا۔اسکول کی وردی میں ملبوس وہ ناشتے کی میز پر رکھی کتاب پر منہ اور آنکھیں بند کیے ہل ہل کر اپنے آپ میں مگن پڑھ رہا تھا۔

اس کی زیرک نگاہوں نے دائیں جانب سفر کیا۔کچن کی کھڑکی واضح تھی۔اندر کھڑی میرم ریحام اور شازیہ دکھائی دیتی تھیں۔مگر وہ اپنے کام میں مصروف تھیں۔وہ سر جھٹک کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

چائے کپوں میں انڈیلتے ہوئے میرم نے کن انکھیوں سے صحن میں جھانکا اور وہ شکر کا کلمہ پڑھ کے رہ گئی۔ اگر جو وہ محراب کو دیکھتی پکڑی جاتی تو؟ یہ سوچ کر ہی اسے جھرجھری آئی۔

''ہائے بیچارہ بچہ۔یہی تو عیش ہوتی ہے گھر میں عورت کے ہونے سے۔نہ کھانے کی فکر نہ دھونے کا خیال۔اب دیکھو کیسے باہر سے ناشتہ لا رہا ہے۔''ان کا روایتی ماؤں والا موڈ پوری طرح آن ہو چکا تھا۔میرم مسکرائی۔

''تو کس نے کہا تھا یہاں آئے؟ رہتا نا اپنی ماں اور بہن کے پاس۔''اس کی طنزیہ آواز پر شازیہ نے اسے گھر کا۔

''چپ کرو تم،نہ جانے اس کی کیا مجبوری ہو گی ورنہ یہی وہ مرد ہوتے ہیں جو بستر سے ایک پیر تک نہیں نیچے اتارتے اور ماؤں، بہنوں پر حکم چلاتے رہتے ہیں۔''ان کے ملول طنز پر میرم نے توسیفی انداز میں ابرو اچکائے۔

''اور پھر شادی کے بعد ساری زندگی اپنی بیویوں کا حکم مانتے رہتے ہیں۔''ان کا لہجہ پل میں متنفر ہو گیا۔وہی جوڑوں کے غلام مردوں سے ماں کا ذاتی عناد۔

''ہر مرد بیوی کی بات نہیں مانتا۔مانتا ہوتا تو آج ہمارے معاشرے کے حالات مختلف ہوتے۔''اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"مرد بڑا انا پرست ہوتا ہے۔ اگر اپنی ضد پر آجائے تو عورت کو پاؤں تلے روند دیتا ہے۔ اسے یہ زعم ہوتا ہے کہ ہمیشہ عورت ہی اس کا حکم مانتی رہے گی۔" وہ مزید بولی۔

"مرد تو عورت کے سر کا سائیں ہوتا ہے۔ عورت کو چاہیے کہ وہ اس کو سمجھے اور اس کی بات مانے۔ یہاں تو شوہر خود بیوی کے قدموں میں بیٹھا ہوتا ہے۔" وہ سخت نالاں تھیں۔

"امی زمانہ بدل رہا ہے۔ اب بیوی کی بات ماننے والے مرد کو سمجھدار اور با احساس سمجھا جاتا ہے۔ جو مرد عورت کا دل رکھنا جانتا ہو، اس کی قدر کرتا ہو، وہی گھر کو آباد رکھ سکتا ہے۔" اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"زمانہ بدلا ہے لیکن زمانے کی ریت روایات نہیں بدلیں۔" انہیں تو جیسے پتنگے لگ گئے تھے۔

"یہ تو ہمارا اپنا قصور ہے۔ ہم اُس زمانے میں رہ رہے ہیں جو بظاہر تو ترقی کی منازل طے کر رہا ہے مگر اپنی فرسودہ روایات ترک نہیں کر پا رہا۔" اس کی آنکھوں میں تاسف در آیا۔

"بیوی کا احساس کرنے، اس کی بات ماننے اور کام میں ہاتھ بٹا دینے سے کوئی مرد خاص نہیں بن جاتا بلکہ یہ سب تو اس کی بنیادی زمہ داریاں ہیں۔ ان سب کاموں سے مرد کی شان نہیں گھٹ جاتی۔ دو 'لائف پارٹنرز' پوری زندگی تبھی ساتھ رہ سکتے ہیں جب وہ دونوں اپنی زمہ داریوں سے واقف ہوں، ایک دوسرے کی عزت کرنا جانتے ہوں اور ان کے درمیان محبت اور عدل وانصاف کا تعلق قائم ہو۔ کیونکہ رشتے سمجھ بوجھ سے چلتے ہیں مقابلے بازی سے

نہیں۔" میرم نے چائے کے کپ ٹرے میں رکھتے جتاتی نظروں سے ماں کو دیکھا۔وہ خاموش ہو گئیں۔

"یہ بوسیدہ رسمیں تو ہمارے جانے کے بعد ہی بدل سکتی ہیں۔" ماں جذباتی ہو گئی تھیں۔

میرم نے نفی میں سر ہلایا۔پاکستانی ماؤں کو سمجھانا درہ خیبر فتح کرنے کے مترادف ہے جو آج تک کوئی نہیں کر پایا۔

"اور ہاں یاد آ گیا،اس نے ایڈوانس میں اس مہینہ کا پورا کرایہ ادا کر دیا ہے۔" شازیہ نے اطلاع دی تھی۔

"پندرہ ہزار؟" کچن سے نکلتی میرم نے تصدیق چاہی۔

"نہیں... منہ مانگے بیس ہزار۔"

"کیا؟" برجستگی سے کہتے وہ ایڑھیوں کے بل پورا گھوم گئی۔

"کوئی بارگیننگ نہیں کی اس نے؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ مجبور کرایے دار اور اتنا سخی؟

"نہیں۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔میرم حیران در حیران تھی۔

”عجیب لڑکا ہے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی برآمدے میں نکل آئی۔ ٹرے میز پر رکھی اور کرسی کھسکا کر نشست سنبھالی۔ فیضان نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈال کر واپس جھکالی۔ وہ کل شام سے اب تک اس سے ناراض تھا۔

”امی آج کوفتے بنائیں؟ بہت دل کر رہا ہے۔“ میرم کی پر لطف اور اونچی آواز سنتے ہی فیضی کے کان کھڑے ہوئے۔

”بنا لینا آکر۔ ابھی جلدی کرو دیر ہو رہی ہے۔“ امی کی تائیدی آواز پر وہ ایک دم سے سیدھا ہوا۔ ساری ناراضی اڑن چھو ہوئی۔ چہرے پر مسکینیت طاری ہو گئی۔ زبان پر کوفتوں کا کبھی نہ بھولنے والا ذائقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ کوفتے اور میرم سے ناراضگی.... ان دونوں میں سے اسے کوفتے زیادہ عزیز تھے۔

ماں اور میرم کہتی تھیں کہ فیضی کوفتوں پر کسی چیز کو بھی ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگلے چند منٹ میں وہ دونوں ناشتہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”اللہ حافظ امی۔“ فیضان نے ماں کے سامنے معمول کے مطابق سر جھکایا۔

”اللہ تمہیں کامیاب کرے۔“ انہوں نے اس پر نیک دعاؤں کا حصار باندھا تھا۔

وہ جلدی سے باہر کی جانب بڑھا۔ فیضان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ میرم نے گاڑی باہر نکالی تو وہ دروازہ بند کرتا ہوا تیزی سے آ کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جیسے ہی ان کی گاڑی گلی کے

موڑ سے مڑی، پیچھے سے دروازے کا چھوٹا پَٹ دوبارہ کھلا۔ محراب قریشی بھورے رنگ کی شلوار قمیص پہنے باہر آیا تھا۔اس نے ایک نگاہ دائیں ہاتھ کی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دوڑائی اور پھر بھورے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا وہ گلی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

چھتوں سے جھانکتی عورتوں... گلی میں کھیلتے بچوں اور مردوں نے بھی استعجاب سے اسے دیکھا تھا۔

عرصے بعد یوسف میانداد کے گھر سے نوجوان مرد نکلا تھا... آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔

گلِ ریگاں میں ایک اجنبی کا اضافہ ہوا تھا... حیرانی بجا تھی۔

محراب قریشی کو دیکھتی ہر آنکھ میں سوال ابھرا تھا۔وہ خود تو سنجیدگی سے سر جھکائے ایک جانب چل دیا تھا مگر محلے داروں کی نظروں میں مبہم سوالات وہیں کے وہیں ٹھہرے رہ گئے تھے۔

☆...☆...☆

دوپہر کی گرمی کو آہستہ آہستہ مغرب کی جانب رواں سورج نے مات دی تو موسم کی خوشگواری کے سبب تمام بچے گلیوں میں کھیلنے نکل آئے تھے۔ایسے میں وہ نیلے اور سفید رنگ کے ستونوں والی حویلی بڑے ٹھاٹھ سے کھڑی چمک رہی تھی۔اگر تم اس کے آہنی

گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھو تو دور سے نظر آتی مرکزی سڑک پر سے کوئی شے گلِ ریگاں کی جانب مڑتی ہوئی دکھائی دے گی۔ قریب آتے ہی وہ منظر واضح ہونے لگا تھا۔

وہ ایک جدید طرز کی بائک تھی جو زوں کی آواز کے ساتھ آگے بڑھتی دائیں اور بائیں جانب درختوں پر موجود پرندوں کے دل دھڑکا رہی تھی۔ انجن کی تیز آواز کے ساتھ ہی وہ بائک ایک دم حویلی کے نیلے گیٹ کے سامنے آرکی۔ بریک پر پاؤں پڑا تو پچھلا پہیہ ایک دم ہوا میں معلق ہو کر واپس ساکت ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، مکمل سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ سیاہ شرٹ میں سے اس کا کسرتی جسم نمایاں تھا۔ ہاتھ گلوز سے ڈھکے ہوئے تھے اور چہرہ ہیلمٹ نے ڈھانپ رکھا تھا۔

وہ پھرتی سے بائک سے اترا۔ اس کے انداز میں کمال بے نیازی تھی۔ دائیں ہاتھ سے ہیلمٹ اتارا تو اس کا چہرہ واضح ہوا۔ سیاہ بال، گندمی رنگت اور عقاب کی سی سیاہ آنکھیں۔ اس نے ہیلمٹ سنبھالتے دونوں ہاتھوں کو بھی سیاہ گلوز کی قید سے آزاد کیا۔ ایک نظر آس پاس دوڑا کر وہ حویلی کی جانب قدم بڑھا گیا۔

"سلام سر۔" دفعتاً دروازے کے ساتھ موجود گارڈ ہاؤس کی چھوٹی کھڑکی کھلی اور چوکیدار کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے زیرِ لب والسلام کہتے ہوئے ہیلمٹ اس کی جانب بڑھا دیا۔

''راشد کیا ابا گھر آ گئے؟''اس نے مکمل رازداری کے ساتھ استفسار کیا۔ ہیلمٹ پکڑتے ہوئے، چوکیدار کا سر نفی میں ہلا تھا۔ مہروز نے آنکھیں میچ کر کھولیں گویا کندھوں پر سے منوں بوجھ سر کا تھا۔

''وہ دوسرے شہر جلسے میں گئے تھے۔ لوٹتے ہی ہونگے۔''چوکیدار کی وضاحت پر اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے پلٹ کر سیاہ رنگ کی ڈوکاٹی پینگیل (Ducati Panigale) کو دیکھا۔

کیا وہ اسے اندر لے جانے کا خطرہ مول لے سکتا تھا؟ دل و دماغ کی جانب سے جواب فٹ سے آیا... نہیں، کبھی نہیں!

''اسے احتیاط کے ساتھ کہیں ٹھکانے لگاؤ۔''وہ ابرو سے اشارہ کرتا ہوا گیٹ کی جانب بڑھنے لگا تھا جب اس کے پاس آ کھڑے ہوئے نسوانی وجود نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔

''نواب صاحب آپ کو بہت ہی ضروری بات بتانی ہے جی۔''وہ تیس پینتیس سالہ عورت چہرے کو دوپٹے کے پلو سے ڈھکے خفیہ انداز میں اس کے قریب کھڑی بولی تھی۔ جواباً وہ ابرو اچکا کر رہ گیا۔

''وہ جی شازیہ بہن نے اوپر والا کمرہ کرایے پر دے دیا ہے۔''وہ لبوں پر زبان پھیرتی گویا ہوئی۔

''تو؟'' وہ لاتعلق بنا۔

''کرایے دار کوئی مرد ہے۔'' وہ جو جھنجھلائے انداز میں اس کی باتیں سن رہا تھا یکدم اس کا رواں رواں کان بنتا گیا۔

''جوان اور خوبصورت۔ لو بھلا بتاؤ جوان بیٹی کے ہوتے ہوئے کسی مرد کو گھر میں گھساتے ہوئے انہیں زرا شرم نہ آئی؟'' وہ مقابل کے متوجہ ہوتے ہی زبان کے تیر چلانا شروع ہوئی تو اس کی سیاہ آنکھوں کی گھوری پر بریک لگی۔

''ہمسایوں کے گھر کی ذاتی زندگی کی ٹوہ لیتے ہوئے آپ کو رتی برابر بھی شرم نہیں آئی؟'' اس کے صاف اور سیدھے طنز پر وہ ایک دم بدک کر پیچھے ہوئی۔ اس کی آواز سخت تھی۔ سکینہ کی سٹی گم ہوئی۔ سر خود بخود نفی میں ہلا پھر اسی تیزی کے ساتھ اثبات میں ہلتا گیا۔

''جاسکتی ہیں آپ۔'' وہ کچھ عرصہ قبل حویلی کی خادمہ نہ رہ چکی ہوتی تو وہ تمام تمیز بالائے طاق رکھ کر اسے جواب دیتا مگر فی الوقت وہ ضبط کر گیا۔ سکینہ 'ہنہہ' میں سر جھٹکتی پلو سنبھالتی وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی۔

وہ سر جھٹک کر گارڈ کے دروازہ کھولنے پر اندر داخل ہوا۔ وسیع رقبے پر پھیلی وہ حویلی اندر سے ایسا مبہوت کر دینے والا حسن رکھتی تھی کہ نظر ٹھہرنے کا نام نہ لے۔ سرسبز قطعوں پر جابجا

پھولوں کی باڑیں، سجے ہوئے پودے اور اطراف میں قد آور درخت ایستادہ تھے۔ان کے بیچوں بیچ پتھریلی روش بچھی تھی، جس پر وہ چلتا جارہا تھا۔

وہ کون؟

نواب مہروز عباسی۔

نواب عالم کا دوسرا سپوت۔نواب خاندان کا گدی نشین۔

وہ حسنِ بے مثال کی اعلیٰ مثال تھا۔اکڑ اور رعب اس کے انگ انگ سے جھلکتا تھا۔ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے جن کے لیے دنیا حقیر اور لوگ فقیر ہوتے ہیں۔جن کی اپنی ذات توان کی نظر میں سب سے اونچی ہوتی ہے مگر وہ دوسروں کی ذات کو حشرات الارض کے برابر سمجھتے ہیں۔

گیٹ سے داخلی دروازے تک پہنچنے میں کم و بیش دو منٹ لگتے تھے سو وہ بے معنی سوچوں میں الجھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔گھر کی عمارت کے دائیں عقب میں ایک بڑا سا حوض تھا۔اس کے پار لاؤنج کا سلائڈنگ ڈور دکھائی دیتا تھا اور اگر نگاہیں ذرا اور دور دوڑاؤ تو لان کی ڈھلوان میں بنی انیکسی اور سرونٹ کوارٹرز نمایاں ہو جاتے تھے۔وہ داخلی دروازے سے اندر داخل ہوا۔

نادل کلب
Clubb of Quality Content

سامنے وسیع دالان تھا۔دائیں جانب کچن اور ڈائننگ ہال جبکہ عین وسط سے گول زینے پہلی منزل کی طرف جاتے تھے۔زینوں کے عقب میں بیڈرومز اور بائیں طرف بڑے مستطیل لاؤنج کا دروازہ تھا۔دالان میں ایک جانب تخت نما جھولا جھول رہا تھا۔چھت میں نصب مضبوط کڑیوں سے بندھا ہوا وہ گہرے شیشم کی لکڑی کا جھولا تھا۔اس پر اطلس کے گہرے سرخ غلاف چڑھے گدّے سجے تھے۔کناروں پر سنہری جھالر لٹک رہی تھی۔ریشمی کشن تخت کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھے۔مگر ان تمام رنگوں کو جھولے پر بیٹھے سفید رنگ میں ملبوس وجود نے مات دے رکھی تھی۔

وہ بڑی بی تھیں۔

اس گھر کی سب سے بزرگ ہستی۔ان کی عمر ستر سے اسی کے درمیان تھی۔نورانی چہرہ جھریوں زدہ تھا اور جسامت عمر کے لحاظ سے متناسب تھی۔

وہ کروشیا کی کناری والی سفید چادر سر پر اوڑھے،گاؤ تکیے سے کہنی ٹکائے بیٹھیں آنکھیں بند کیے زیر لب کچھ پڑھ رہی تھیں۔ایک ملازمہ ان کے پیچھے کھڑی کندھے دبا رہی تھی۔

مہروز کو دیکھ کر اس نے ہلکے سے ان کا کندھا جھنجھوڑا۔وہ پٹ سے آنکھیں کھول کر اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔وہ جو کنی کترا کر گزر جانا چاہتا تھا،بڑی بی کی غصیلی ہنکار پر مجبوراً ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”اسلام علیکم بی جان۔“ وہ ان کے سامنے سر جھکا گیا۔ جواباً انہوں نے جھریوں بھری کلائیوں میں سونے کے کنگن جڑا، کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھا تھا۔

”وا علیکم اسلام۔ جیتے رہو۔“ لہجہ بدستور کرخت تھا۔

”مل گئی فرصت آوارہ گردی سے؟“ انہوں نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔ مہروز نے سر ہلایا اور جھولے کے سامنے رکھی تپائی پر بیٹھنے لگا کہ بڑی بی نے لاٹھی اٹھا کر اس کی ٹانگوں پر ضرب لگائی۔ وہ اچھل کر ان کی پہنچ سے دور جا کھڑا ہوا۔

”مان گیا کہ بڑے نواب کی بیوی میں اب بھی دم ہے۔“ اس کی زبان پھسلنے کی دیر تھی۔ بڑی بی کا ہاتھ دوبارہ لاٹھی کی جانب بڑھا۔

”کیوں بھری عمر میں پوتے کو اپاہج کرنا چاہتی ہیں؟“ وہ احتجاجاً بول اٹھا۔

”اپاہج ہی سہی، کم از کم ان ٹانگوں کو سکون تو میسر ہو گا۔ غضب خدا کا! کل رات کے گئے تم اب لوٹے ہو۔ کچھ احساسِ زمہ داری ہے بھی یا ساری زندگی آوارہ ہی پھرتے رہو گے؟“ وہ بپھر گئی تھیں۔ کچن میں کام کرتی ملازماؤں نے تنگ آ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ یہ نواب زادہ صبح شام ڈانٹ کھا کر بھی نہیں سدھرتا تھا۔

”بی جان تھوڑا آہستہ بولیں پلیز۔ ملازموں کے سامنے میرا اور اکم ہو جائے گا۔“

”تیرے اور اشورا کی ایسی کی تیسی۔“ان کی آواز مزید اونچی ہو گئی۔مہروز نے تلملا کر ادھر ادھر دیکھا۔

”ارے تجھ جیسی نکمی اور آوارہ اولاد ہو تو چراغ تلے اندھیرا ہی رہتا ہے۔“انہوں نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر اسے کوسا۔

”آوارہ ہی ہوں نا آپ کی طرح فارغ تھوڑی ہوں۔“وہ تیزی سے بولا۔اور پھر اسی پھرتی سے زینوں کی جانب دوڑ لگائی۔کوئی کہہ سکتا تھا کہ وہ تین سال کا شرارتی بچہ نہیں، تیس سال کا بھرپور مرد ہے؟

شاید اس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ اپنی بی جان کے سامنے بالکل چھوٹا بچہ بن جاتا تھا۔اور اسے جو سکون ان کے ناک میں دم کر کے ملتا تھا، شاید ہی دنیا کے کسی کام سے ملتا ہو۔

”ٹھہر جا ذرا! تیرے باپ کو آ لینے دے، کان کھنچواتی ہوں تیرے۔“وہ سیخ پا ہوئیں۔

”ابا جی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“وہ ہانک لگاتا زینے چڑھا۔

”بگڑے ہوؤں کا کیا بگاڑنا؟ ساری بات اس تربیت کی ہوتی ہے۔اگر تم پر ذرا دھیان دیا گیا ہوتا تو یوں دندناتے نہ پھرتے۔“مہروز کے ہولے سے مسکراتے لب یک دم سکڑ گئے۔کیا لوگوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہماری ذات پر اس جگہ حملہ کریں جہاں چوٹ گہری لگتی ہو؟

"وہ کہاں ہے؟" اسے مجبوراً موضوعِ گفتگو بدلنا پڑا تھا۔ بڑی بی نے بددلی سے سر جھٹکا۔

"اپنے ہجرے کے علاوہ کہاں ہونا ہے اس نے۔" وہ نخوت سے بولیں۔ مہروز نفی میں سر ہلاتا اوپر کی جانب بڑھ گیا۔

"لوگوں کو اپنے رویوں سے خوش رکھنے کا شوق ہو تو اپنے اعمال بھی خوش آئند رکھنے چاہیئں۔" پیچھے ان کی بڑبڑاہٹ واضح تھی۔ ملازمہ کو سر دبانے کا اشارہ کرتیں وہ اپنی سابقہ حالت میں واپس چلی گئیں۔

☆...☆...☆

رات کے پچھلے پہر گھر گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دور کہیں جھینگروں کی آوازیں ماحول کو پراسرار بنا رہی تھیں۔ جب اپنے کمرے میں محوِ استراحت محراب یکایک چونک کر جاگ اٹھا۔ سانس تیز اور پھولی ہوئی تھی۔ پیشانی اور ہتھیلیاں پسینے میں شرابور تھیں۔ دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے چین تھا۔

سرمئی آنکھوں کے اس پار بیدار ہوتا ذہن ابھی تک خواب کی گرفت میں تھا... ایک دھندلا مگر ناقابلِ فراموش خواب۔

وہ چند لمحے یوں ہی بیٹھا رہا۔ کمرے میں مدھم اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پنکھے کی ہلکی اور ٹھنڈی ہوا بھی اسے پرسکون کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ پونچھا اور سانسیں بحال کرتا بستر سے اتر آیا۔

کچھ دیر بعد باتھروم کا دروازہ کھلا اور سفید روشنی نے کمرے کو نیم منور کر دیا۔ وہ باتھروم سے نکلتے ہوئے کہنیوں تک موڑے کف سیدھے کر رہا تھا۔ وضو نے اس پر چھایا نیند کا سارا غلبہ دھو ڈالا۔

تپائی پر رکھی جائے نماز اٹھا کر وہ باہر نکل آیا۔ چھت پر ٹھنڈی اور نرم ہوا چل رہی تھی۔ آسمان بے حد صاف تھا اور چاند اپنی پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ اس نے جائے نماز بچھائی اور قبلہ رُخ کھڑا ہو گیا۔

''اللہ اکبر۔'' تہجد کی نیت باندھتے ہی اس کے دل نے ساری عاجزی اور انکساری سمیٹ کر رب کے حضور خود کو پیش کر دیا۔

پاک ذات سے ہمکلام ہوتے ہی اس کے دل میں مچا شور تھم سا گیا۔ رکوع، سجدہ، قعدہ... ہر حرکت کے ساتھ اس کے اندر کچھ ٹوٹا ہوا جڑنے لگا تھا۔ دل پر پڑا اسقیل بوجھ سرکنے لگا تھا۔ دھڑکن معمول پر آ رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی پیاسے کو پانی مل گیا ہو.... جیسے روح جی بھر کے سیراب ہو گئی ہو۔

Clubb of Quality Content

اور اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی میں برکت ہے۔ تم اس کی طرف جھک کر دیکھو، وہ ساری دنیا کو تمہارے سامنے جھکا دے گا۔

نماز ختم ہوئی تو وہ دیر تک جائے نماز پر دوزانو بیٹھا دعا مانگتا رہا۔ خدا جانے وہ کیا مانگ رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ درد کی شدت سے سرخ ہو گیا۔ آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ چاندنی نے اسے اس قدر گریہ وزاری کرتے دیکھا تو لبوں پر ہاتھ رکھے دنگ رہ گئی۔

دعا مانگنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جائے نماز تہہ کر کے منڈیر پر رکھ دی اور وہیں کھڑا ہو گیا۔ چاند کی روشنی میں وہ اٹھی گردن والا مرداب پرسکون معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بہت سے جذبات یکجا تھے۔ اسی لمحے اس کی نظر نیچے صحن کی طرف پھسلی اور وہ ٹھٹھک گیا۔ نیم اندھیرے میں میرم ریحام صحن میں جائے نماز بچھائے بیٹھی تھی۔ سر جھکا ہوا، ہاتھ اٹھے ہوئے اور عارضوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ چاندنی نے اس کے گرد بھی سوگوار سا حصار باندھ رکھا تھا۔

محراب خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے اس لڑکی کو کمزوری کے لمحے میں دیکھا تھا۔ دن کے وقت وہ ایک مضبوط اور محتاط سی لڑکی لگتی تھی۔ دوسروں کو ان کی حدود میں رکھنے والی... اپنے رشتوں کی خاطر سب کچھ تیاگ دینے والی مگر اس وقت وہ اپنی ٹوٹی بکھری حالت میں اس کے سامنے تھی۔ اس نے آنکھیں جھپکیں۔ نگاہوں کو اس پر سے

ہٹانا چاہا مگر کسی نادیدہ قوت نے اس کا ارتکاز باندھے رکھا۔ وہ چاہ کر بھی اس منظر سے نگاہیں نہیں ہٹا پایا۔

میرَم کے لب ہل رہے تھے۔ وہ کچھ مانگ رہی تھی... اس سے جس پر اس کا یقین دنیا سے زیادہ تھا۔ وہ جو کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔

آخر کار اس نے بمشکل اپنی نظریں پھیریں اور دل میں بے نام سی کسک لیے وہ واپس اندر چلا گیا۔ نیچے وہ ابھی تک ہاتھ دعا کی صورت اٹھائے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے خود پر کسی کی نگاہوں کا احساس بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔ مگر وہ نظرانداز کر گئی۔

یہ لمحے اس کے لیے قیمتی تھے۔ وہ اپنے رب سے مانگنے میں مصروف تھی۔ اس رب سے جس نے اسے زندگی دی تھی... مقصد دیا تھا۔ اور میرم ریحام جانتی تھی۔ چاہے آزمائشیں کتنی ہی کڑی کیوں نہ ہوں.... انسان کے ہاتھ میں موجود کاملِ یقین کی رسی اسے ہر آزمائش سے گزار دیتی ہے۔

☆...☆...☆

وقت سبک رفتاری سے گزر رہا تھا۔ اسے یہاں آئے ہوئے تقریباً ہفتہ ہو چکا تھا۔ انسان کی ایک فطرت ہے کہ وہ کہیں بھی، کسی بھی ماحول میں زیادہ دیر تک اجنبی نہیں رہ سکتا۔ ابتدا میں راستے بے معنی، چہرے غیر شناسا اور ماحول اجنبیت بھرا ہوتا ہے مگر یہی انسان رفتہ رفتہ

اس ماحول سے مانوس ہونے لگتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرائے چہرے معمول بن جاتے ہیں اور راستے روزمرہ کا حصہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کہیں رہنے نہیں آتا بلکہ رہتے رہتے 'رہنا' سیکھ جاتا ہے۔ یہی اس کی جبلت ہے کہ وہ ہر نئے مقام پر اپنی جگہ بنالیتا ہے۔

اسی فطری کیفیت کے پیش نظر یونانی فلسفی ارسطو نے کہا تھا،

"انسان معاشرتی حیوان ہے۔"

Man is a social animal.

آج وہ جمعے کے بعد تاخیر سے واپس لوٹا تھا۔ گلی میں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ہنسی، شور اور دوڑتے قدموں کی آوازیں فضا میں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک جانب دیوار سے لگے سنگی بینچ پر فیضان بیٹھا تھا۔ گلی میں کھیلتے بچوں سے یکسر بے نیاز... اسے کھیل میں دلچسپی تھی نہ وہ تماش بینوں میں شامل تھا۔ وہ واقعی عجیب تھا۔

گھر کی طرف بڑھتے ہوئے وہ محلے والوں کی نظریں خود پر بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ کتنے عجیب لوگ تھے جنہیں دوسروں کی زندگیوں میں تانکا جھانکی کیے بغیر چین نہیں آتا تھا۔

"کرایے دار صاحب!" فیضان کی اونچی آواز پر وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ فیضان تیزی سے اس کے قریب آرہا تھا۔ وہ ماتھے پر بل ڈالے اسے دیکھے گیا۔

"کیا ہے؟" اس نے استفسار کیا۔ فیضان نے جواباً کندھے اچکائے۔

"کچھ نہیں۔(وہ مسکرایا)آؤ تمہیں اپنا گلِ ریگاں دکھاؤں۔" وہ اشتیاق سے اس کا ہاتھ تھام گیا۔ محراب انکار نہیں کرسکا اور اس کے پیچھے کھنچتا چلا گیا۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" محراب کے پوچھنے پر اس نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے سامنے کیا۔اس نے ایک شاپر میں کچھ گوشت تھام رکھا تھا۔

"یہ کہاں سے لیا؟"

"اپنی پاکٹ منی سے۔" وہ دونوں ایک گلی میں مڑ گئے۔دونوں اطراف میں بے شمار دکانیں تھیں۔ محراب پہلی مرتبہ اس راستے سے گزر رہا تھا۔

"کیا کروگے اس کا؟" اس نے ایک نظر دوبارہ اس شاپر پر ڈالی۔ جس میں موجود گوشت خون آلود اور چھیچھڑوں سے بھرا ہوا تھا۔

"بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گا۔" اس نے پیکٹ محراب کی جانب بڑھایا۔جو اس نے حیرانی سے تھام لیا۔اب کہ فیضان جیب سے سفید رنگ کے دستانے نکال رہا تھا۔

"واٹ؟ تم اس چھیچھڑوں سے بھرے گوشت سے لوگوں کو کھانا کھلاؤ گے؟" محراب کو ابکائی سی آئی۔ فیضان نے دستانے پہنتے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

Clubb of Quality Content

"میں کب کہا کہ لوگوں کو کھانا کھلاؤں گا؟ میں نے کہا بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گا۔" وہ منہ بسورتا ہوا اس سے شاپر لے کر ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔ محراب نے اس کی تقلید کی مگر اسے وہیں رک جانا پڑا۔

وہاں بڑے بڑے کچرے کے ڈبے رکھے تھے۔ اور ان کے آس پاس دس بارہ بلیاں منڈلا رہی تھیں۔ فیضان کسی معمول کی طرح گوشت نکال نکال کر مختلف جگہوں پر رکھ رہا تھا۔

"یہ تمہیں بالکل بھی نہیں کھائیں گی۔" اس نے محراب کے ٹھہر جانے پر چوٹ کی۔ وہ مسکرا دیا۔

"تم روزانہ نہیں کھانا کھلاتے ہو؟" وہ حیران ہی تو ہوا تھا۔ فیضان نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔ ہر تیسرے دن، جب پاکٹ منی جمع ہو جاتی ہے تو ان کے لیے گوشت خرید لیتا ہوں۔" اس نے ایک نظر کچرے کے ڈبوں پر ڈالی تھی۔ تین کے ڈھکن بند تھے جبکہ پہلے دو کے ڈھکن سرے سے غائب تھے۔ اس نے خالی شاپر اور دستانے بِن میں پھینک دیے۔

"اللہ بخشے ان نشئیوں اور جواریوں کو، پھر سے ڈھکن چوری کر کے لے گئے۔" وہ افسوس سے سر ہلاتا ہوا گلی سے باہر نکل رہا تھا۔ محراب نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ کہیں سے بھی لاابالی سا بچہ نہیں لگتا تھا۔

"اب کیا کرو گے؟" وہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"محلے کے نامی گرامی لوگوں کو درخواست لکھوں گا۔"اس کے لہجے میں ناپسندیدگی کی جھلک تھی۔

"کس کو؟"

"نواب عالم کو۔"اس نے نام دانتوں تلے چبایا تھا۔ محراب سر ہلا گیا۔البتہ چہرے کے خدو خال میں تناؤ در آیا تھا۔

"غالباً تمہیں پیٹس پسند ہیں؟"اس نے مبہم مسکراہٹ کے ساتھ استفسار کیا۔

"مجھے پیٹس پسند ہیں مگر آپی رکھنے نہیں دیتیں۔"فیضان نے افسردہ سانس خارج کی۔

"کیوں؟" محراب حیران ہوا۔

"انہوں نے مجھے گھر میں رکھا ہوا ہے۔یہ احسان کم نہیں ان کا؟"اس کے معصومیت بھرے لہجے پر محراب ہنس دیا۔

"تمہارے دوست تمہاری کمپنی بہت انجوائے کرتے ہونگے۔"اس نے فیضان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی حسِ مزاح کی تعریف کی تھی۔

"میرے دوست نہیں ہیں۔"اس نے محراب کا ہاتھ ہٹایا نہیں یونہی چلتا رہا۔

"سچ؟" بے یقینی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

”گلِ ریگاں کے لوگ میرے اسٹینڈرڈ پر پورا نہیں اترتے۔ لہٰذا میں ان سے دوستی نہیں کرتا۔“ فیضان نے ناک سے مکھی اڑائی۔ اس کے مغرورانہ انداز دیکھ کر محراب کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”میں گلِ ریگاں کا باسی نہیں ہوں۔ مجھے دوست بنا لو۔ فائدے میں رہو گے۔“ محراب کی فوری پیشکش پر فیضان یوسف کے چلتے قدم رک گئے۔ اس نے چند سیکنڈ محراب کے خوبرو چہرے کو بغور جانچا آیا کہ یہ پیشکش اس کی جانب سے ہی کی گئی تھی۔ پھر اس کے لب شرارتی مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔

”میں تم جیسے روڈ اور ایروگنٹ انسان کا دوست بننا بھی پسند نہیں کرتا۔“ وہ قہقہہ لگاتا ہوا بھاگ گیا تھا۔ محراب حیرانی سے اس کی پشت تکتا رہ گیا۔

”آپی سے پوچھ کر بتاؤں گا۔“ گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے پرجوش آواز میں کہا تھا۔ پھر وہ اونچی آواز میں کچھ گنگناتا ہوا اندر چلا گیا۔ محراب سر جھٹکتا ہنس دیا۔ ایک یہ چھوٹو اور اس کی الٹی کھوپڑی والی آپی۔

’ہنہ آپی کا چمچہ۔‘ وہ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

☆...☆...☆

ستمبر کے آخری ایام کی صبح جس قدر نم آلود ہوا سے لبریز تھی وہیں دن میں سورج کی تپش ماحول کو گرما دیتی تھی۔ایسے میں اگر اس سیکنڈری اسکول کا رخ کرو تو وہ چھٹتی صبح میں چمک رہا تھا۔آج میرم ریحام پرنسپل آفس میں بیٹھی تھی۔عنابی رنگ کا دوپٹہ سر پر اوڑھے وہ بادامی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی۔چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کا جال بچھا تھا۔سامنے میز کے اس پار پرنسپل صاحبہ براجمان تھیں۔عمر پنتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ان کی پیشانی پر بچھی باریک شکنیں،ان کے مزاج کی سختی اور اصول پسندی کی غماز تھیں۔ان کے عقب میں خوبصورت نقش و نگار سے بنی شیلف پر ان کی کامیابیوں کے پرچم لہرا رہے تھے۔پورے آفس میں ان کی رعب دار شخصیت کا سحر طاری تھا۔

”دیکھو میرم، یہ پروگرام سال میں ایک بار آتا ہے۔تمہارا کام بچوں کو تیار کرنا ہے نہ کہ کسی غیر اہم نقطے کو لے کر بحث کرنا۔ہمیشہ یہ پروگرام جس طرح منعقد ہوتا آیا ہے اس بار بھی ویسے ہی ہوگا۔اس میں انکار کرنے کی کوئی خاص وجہ؟“پرنسپل نے کرسی کی پشت سے ٹیک ہٹائی اور دونوں ہاتھ میز پر دھر لیے۔میرم نے تکان بھری گہری سانس لی۔پچھلے دس منٹ سے وہ یہی بحث چھیڑے بیٹھی تھیں۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ چھ ستمبر کی یومِ دفاع کی تقریب کسی وجہ سے ملتوی ہو گئی تھی، اور اب اسے جماعت دہم کی پوزیشن ہولڈرز کی تقریبِ انعامات کے ساتھ شامل کر دیا گیا تھا۔

"میڈم، میری صرف یہ رائے ہے کہ ہم بچیوں سے ویلکم ڈانس نہ کروائیں اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اسکول کی سطح پر قومی تقریبات کی اصل روح تو یہ ہونی چاہیے کہ ہم انہیں کسی بامقصد انداز سے منائیں، خالی نمائش کی طرح نہیں۔" وہ نرمی سے انہیں قائل کرنا چاہ رہی تھی۔

"نمائش؟ یہ ہمارا کلچر ہے۔ اس سے بچوں میں اعتماد آتا ہے۔ انہیں اپنی ثقافت کے اصل معنی معلوم ہوتے ہیں۔" پرنسپل کی نگاہوں میں حیرت اور خفگی در آئی۔ میرم ان کے تاثرات سے بے پرواہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔

"ہم کلچر کے نام پر بچیوں کو ثقافتی لباس پہنا کر، رقص کروا کر ثقافت کا بیڑا غرق کر رہے ہیں۔ چھوٹی بچیوں کو ایسے بنا سنوار کر پیش کرنا سراسر غلط ہے۔ ہم تقریری مقابلے کروا سکتے ہیں، ملی نغمے گا سکتے ہیں، شہدا کی قربانیوں پر ڈرامہ تیار کر سکتے ہیں... مگر یہ ویلکم سانگز، ملی نغموں پر ڈانس؟" اس نے قطعی انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ پرنسپل کے ابرو سکڑ گئے۔

"تمہیں لگتا ہے کہ بچیوں کا ڈانس غیر اخلاقی ہے؟" پرنسپل کا لہجہ خشک اور ناپا تلا سا تھا۔

"میرا نقطہ نظر صرف یہ ہے کہ بچیاں اسٹیج پر رقص کر رہی ہوں، ان پر بشمول مرد حضرات والدین، نگران اور چیف گیسٹس کی نظریں لگی ہوں، یہ سب مناسب نہیں ہے۔ خاص طور پر ایسی تقریب میں جس کا مقصد دفاعِ وطن کی یاد تازہ کرنا ہے۔" کمرے میں چند لمحوں کی خاموشی پھیل گئی۔

"والدین کو تو اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ انہیں یہ سب پسند آتا ہے۔ ویڈیوز بنتی ہیں، سوشل میڈیا پر اسکول کی شہرت بڑھتی ہے۔" ان کی مفہم پرست آواز پر میرم نے دکھ سے انہیں دیکھا۔ کیا انہیں اسکول کی شہرت بچیوں کی عزت سے زیادہ عزیز تھی؟

"اگر ہماری تعلیم صرف دکھاوے کی بنیاد پر ہو تو ہم بچوں کو کیا سکھا رہے ہیں میڈم؟ اگر اسکول کالجوں میں انہیں رقص سکھایا جائے گا تو ان کی تربیت کون کرے گا؟ ہم انہیں یہ کیوں نہ سکھائیں کہ وطن سے محبت صرف گیت گانے یا رقص کرنے سے ثابت نہیں ہوتی۔ انہیں اسٹیج پر دل کی بات کہنے کا حوصلہ دینے کی بجائے ہم انہیں دوسروں کی خوشی کے لیے سنوار کر پیش کیوں کریں؟" اس نے ملتجی انداز میں ایک ہاتھ میز پر دھرے تحمل سے اپنی بات ان کے گوش گزاری۔ جواباً پرنسپل صاحبہ خاموش رہیں تو اس کا حوصلہ مزید بڑھ گیا۔

"بچی چھوٹی ہو یا بڑی، کم سن ہو یا بالغ، اول جماعت کی طالب علم ہو یا دہم جماعت کی... وہ لڑکی ہوتی ہے۔اس کی اپنی عزت ہوتی ہے۔ماں کی گود سے نکل کر بچہ جس درسگاہ میں جاتا ہے وہ اسکول اور مدرسے ہوتے ہیں اور درسگاہ اگر تعلیم کے ساتھ تربیت نہ دے سکے تو ایسی درسگاہ کا کیا فائدہ؟" وہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔

"بے شک یہ تقریبات اور اس میں پیش کی جانے والی دوسری خدمات غیر اخلاقی نہیں ہیں۔ مگر بچیوں کو چیف گیسٹس کی آمد کے لیے بینڈ باجے لے کر کھڑا کرنا، ڈانس پیش کرنا اور حاضرین کو انٹرٹین کرنے کے لیے ملی نغموں پر باقاعدہ رقص کروانا نازیبا بھی ہے تو تعلیمی اداروں کی روایت کے غیر موزوں بھی۔" بات کرتے کرتے اس کا تنفس پھول گیا۔آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔دل پر اپنے الفاظ کے زیاں کا بوجھ گرنے لگا تھا۔اور پھر سب سے بڑا زیاں الفاظ کا ہوتا ہے۔

پرنسپل نے چند ثانیے اس کے تاثرات ملاحظہ کرنے کے بعد اپنے سامنے رکھی فائل کھولی اور اس پر لکھی فہرست پر نظر دوڑائی۔

"تم نے کب سے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ اسکول سسٹم ٹھیک نہیں ہے؟" ان کے سطحی لہجے پر میرم نے جبڑے بھینچ لیے۔

"جب سے مجھے اس سب کی زمہ داری ملی ہے۔اور میں اس سو کالڈ روایت کا حصہ نہیں بن سکتی۔معذرت، مگر میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میں اس نازیبا کام کی مرتکب ٹھہروں۔" وہ ایک دم میز پر رکھا اپنا بیگ اٹھاتی کھڑی ہو گئی۔اس کی متفکرانہ سوچ پر پرنسپل گہرا سانس بھر کر رہ گئیں۔

"تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھانا کب چھوڑو گی؟" ان کے سوال پر میرم نے لب دبائے۔

"بات بچیوں کے فائدے کی ہے۔اس معاشرے کے معیار کی ہے۔کیا یہ غلط ہے؟" اس نے کندھے اچکائے۔

"تم جانتی ہو ان سب دلائل کے باوجود...آخری فیصلے کا اختیار میرے پاس ہے۔" لہجہ چبھتا ہوا تھا۔میرم نے نظریں اٹھائیں۔پرنسپل آنکھوں میں چیلنج لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔وہ "جیسے آپ کی مرضی" والے انداز میں انہیں دیکھتی مسکرا دی۔

منظر بدلا۔

وہ تیز تیز قدموں سے ہال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ہال میں داخل ہوتے ہی بھنبھناہٹ اور بچیوں کی آوازیں کانوں میں پڑنے لگیں۔چند لڑکیاں اسٹیج سجا رہی تھیں۔وہیں اسٹیج پر کھڑے آٹھ لڑکیوں کے گروپ نے اسے دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلایا۔

"میم... ہم بریک لے لیں۔ تھک گئے ہیں۔" ایک بچی کی آواز ابھری تو میرم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں بریک لے لو۔ پھر ہم ڈرامے کی پریکٹس کریں گے۔" اس نے ڈائس پر رکھا سامان سمیٹنا شروع کیا۔

"ڈرامہ لیکن میم ہم تو ڈانس..."

"نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"ہم یومِ دفاع پر شہداء کی قربانیوں پر مبنی ڈرامہ تیار کریں گے۔" جواباً ان کی خوشی میں لپٹی آواز اور تجسس بھری سرگوشیوں پر میرم کے دل سے نادیدہ بوجھ سرکا تھا۔ کندھے خود بخود سیدھے ہو گئے۔ آنکھوں میں خیرہ کر دینے والی چمک پھیل گئی۔

☆...☆...☆

اوپر چھت پر بنے کچن میں اس وقت محراب قریشی کھڑا تھا۔ سفید ٹی شرٹ پر سیاہ ٹراؤزر پہنے وہ عام سے حلیے میں تھا۔ جھکی نگاہیں ہاتھ میں تھامے کپ پر مرکوز تھیں۔

Clubb of Quality Content

''تمہیں تب تک وہاں رہنا ہے، جب تک میں واپس نہ بلاؤں۔''ٹن، ٹن، ٹن، کی آواز سے کپ میں جھاگ بناتی کافی پھینٹتے ہوئے اس کے ذہن کے پردوں پر ناپسندیدہ مناظر لہرائے تھے۔ چمچ پر گرفت سخت ہوتی گئی اور اس نے ایک جھٹکے سے چمچ سنک میں اچھال دیا۔

''یاد رکھنا محراب قریشی تمہیں واپس پلٹ کر آنا ہو گا۔ ہر صورت میں، ہر حال میں۔'' محراب نے گرم دودھ کو زور سے پھینٹا۔ سفید جھاگ بنتی گئی... بالکل نرم، روئی کے گالوں جیسی۔ کپ میں کافی ڈالی تو بھاپ سیدھی اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی کافی تیار تھی۔ سوچوں میں گم وہ کپ لبوں کے قریب لے کر گیا۔ کافی بینز کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تو ذہن کے دریچے پر کوئی اور منظر ابھرنے لگا۔

''کیوں پیتے ہو یہ کڑوا سیاہ مائع؟ دفع کرو ایسے کھولتے پانی کو جو تمہارے معدے تک میں کڑواہٹ بھر دے۔'' کہیں سے مردانہ آواز ابھری تھی۔ اس نے کپ لبوں سے دور کر دیا۔ کپ کی سطح تک ابھرا ہوا بھورا مائع اسے اپنی جانب مائل کر رہا تھا۔

''زندگی میں بعض دفعہ کڑوے گھونٹ بھرنے پڑتے ہیں۔'' عجیب سی منطق نے اس کے لبوں پر دھیمی مسکان پھیلا دی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ کثرت سے بلیک کافی پینے کا عادی تھا۔ اور اب (اس نے گہری سانس بھری) وہ ہر قسم کی کافی پی لیتا تھا سوائے بلیک کافی کے۔

"کبھی میٹھے گھونٹ بھی بھر لینے چاہیں۔ نفسیات کہتی ہے کہ جب انسان کچھ میٹھا کھاتا ہے تو اس کے دماغ میں ایک ڈوپامین نامی کیمیائی مادہ پیدا ہوتا ہے جو انسان کو لمحاتی خوشی، سکون اور اطمینان دیتا ہے۔ کبھی اپنی کافی کے بدلے چائے چکھ کر دیکھو۔" چائے تو اس نے آج تک نہیں پی تھی۔ ماسوائے اس دن میرم کے ہاتھوں.... لیکن وہ میٹھی نہیں نمکین چائے تھی۔ ڈوپامین کا تو پتا نہیں البتہ وہ اس کا فشارِ خون ضرور تیز کر گئی تھی۔ اس نے کپ کی سطح پر انگلی پھیری تبھی اس کا دل یک دم ساکن ہوا۔

کچن کے کھلے دروازے سے آتی فضا کسی کی موجودگی کا پیام ساتھ لائی تھی۔ وہ چونک گیا۔ وہاں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود تھا۔ اس کے قدم بے ساختہ کھلی چھت کی جانب بڑھنے لگے۔ باہر چھت پر چاندنی کسی چادر کی طرح بچھی تھی۔ مدھر فضا اور سناٹے میں اسے وہاں کوئی ذی روح نظر نہ آیا مگر اس کے شارپ سینسز اسے کسی دوسرے وجود کی موجودگی کا عندیہ دے رہے تھے۔

وہ دبے قدموں دائیں جانب بڑھا۔ وہاں اختتام پر ایک جانب چھت کا بڑھا ہوا بغیر منڈیر والا حصہ تھا جس کے نیچے گاڑی کھڑی کی جاتی تھی۔ پوری چھت سے یہ جگہ بلکل الگ تھلگ تھی۔ وہ کافی کا مگ تھامے آگے بڑھتا گیا۔

"یہ یہاں؟" اس کے لیے میرم کی موجودگی حیرانی کا باعث تھی۔ بھلا اتنی رات میں اسکا یہاں کیا کام؟

"اہم، اہم۔" وہ گلا کھنکھارتے ہوئے اپنی موجودگی کا پتا دیتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔ میرم نے چونک کر سیاہ آسمان سے نگاہیں ہٹائیں۔

"آپ اس وقت ادھر کیا کر رہی ہیں؟" اس نے نرمی سے استفسار کیا۔ میرم نے چہرہ اٹھائے اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں سکوڑی تھیں۔

"کیا ایک مکان کے ساتھ تم پوری چھت کا بھی کرایہ دیتے ہو؟" اس نے لٹھ مار انداز میں جس طرح پوچھا تھا، محراب لب دبائے کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"بھلے سے پوری چھت لے لو مگر یہ حصہ میرا ہے۔ آج سے نہیں ہمیشہ سے۔ اور یہاں میں کسی بھی ایرے غیرے کی موجودگی برداشت نہیں کرتی۔" وہ بالواسطہ اسے وہاں سے جانے کا کہہ رہی تھی۔ جواباً وہ کچھ بھی بولے بنا اس سے چھے سات قدم دور بیٹھ گیا۔ بالکل اسی کے انداز میں۔ کافی کا کپ اس نے درمیان میں رکھ دیا۔ میرم نے ایک سرسری سی نگاہ کافی پر ڈال کر ہٹا لی۔

"پتا ہے آپ کے بہاولپور کی خوبصورت بات کیا ہے؟" اس نے دور آسمان پر نظریں پھیلائیں تھیں۔ میرم نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔

"یہاں کا آسمان بہت پیارا ہے۔ حسین اور دلکش۔" اس کے عنابی لبوں پر مسکراہٹ بکھری تھی۔

"وہ کیسے ؟" میرم کی آنکھوں میں نا سمجھی ابھری۔

"دوسرے شہروں کے مقابلے میں بہاولپور کا آسمان خالی نہیں ہے۔ رات کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے ستاروں سے بھرا تھال الٹ دیا ہو۔" اس کا مشاہدہ تھا بھی تو کس پر، آسمان پر؟

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ آسمان تو ایک ہی ہے۔" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔ وہ تائیدی انداز میں مسکرا دیا۔

"آسمان تو واقعی ایک ہی ہے... مگر جب لائٹ پولوشن (روشنی کی آلودگی) بڑھ جائے تو ستارے چھپ جاتے ہیں۔ وہ کم نہیں ہوتے بلکہ ہمیں نظر کم آتے ہیں۔ زمین کی چمک جتنی بڑھتی ہے آسمان کی چمک اتنی ہی ماند پڑ جاتی ہے۔" وہ جیسے ماورائی وسعتوں میں گم تھا۔

"بہاولپور میں لائٹ پولوشن کم ہے۔ کچھ علاقوں میں تو ستاروں کے یلغار صاف دکھائی دیتے ہیں۔" اس کی بات پر میرم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آسمان کو دیکھا۔ وہاں ہر طرف ستارے ہی ستارے تھے۔ اتنے صاف شفاف کہ نگاہ ہٹانے کو دل نہ چاہے۔ مگر اس نے فوراً

ناولز کلب
Club of Quality Content

اپنی نظریں پھیر لیں۔ بہاولپور اس کی اولین پسند تھا۔اور وہ اپنی پسندیدہ چیزوں کے بارے میں دوسروں کی رائے سننا کبھی پسند نہیں کرتی تھی۔

”فیضی بتارہا تھا کہ تم نے اسے پرپوز کیا ہے؟“اس نے بات کا رُخ بدل دیا۔

”لاحول ولا قوہ!“میرم کے سوال پر وہ برجستگی سے لاحول پڑھ کر رہ گیا۔

”میرا... میرا مطلب دوستی کا پرپوزل تھا۔“وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

”اس سے پوچھا تو پتا چلا کہ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے اس جیسے شوخ و چنچل بچے کا کوئی دوست نہیں۔“اس نے افسوس اور حیرت کا برملا اظہار کیا۔

”ایسی تو بات نہیں ہے۔اس کی واحد دوست میں ہوں۔“اس نے تفاخر سے کہا۔ محراب نے ہنس کر ٹھنڈی ہو چکی کافی کا کپ سائیڈ پر کر دیا۔اب وہ پینے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”آپ بہن بھی تو ہیں۔ لڑکوں کے دوست لڑکے ہی اچھے لگتے ہیں۔“اس کے سنجیدہ انداز پر میرم نے نا فہمی سے اسے دیکھا۔

”فیضی کو کسی کی ضرورت نہیں ہے۔“اس بار لہجے میں سختی تھی۔

”آج نہیں ہے تو کل ضرور ہو گی۔ وہ بڑا ہو رہا ہے۔ عمر کے اس دورانیے سے گزرتے ہوئے اسے اپنے مسائل اور پریشانیاں بانٹنے کے لیے دوست درکار ہیں بہن نہیں۔“وہ وضاحت کر رہا تھا۔ میرم تیکھے چتونوں سے اسے دیکھے گئی۔

"انسان جب بڑا ہوتا ہے تو اسے لوگوں سے زیادہ ایسے ساتھی درکار ہوتے ہیں جو اس کی الجھنیں سمجھ سکیں۔ اور وہ دوست ہی ہوتے ہیں جو بغیر کچھ کہے سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔" اس کی منطق پر میرم سر جھٹک کر رہ گئی۔

"دوستی خونی رشتوں سے زیادہ اہم نہیں ہوتی۔" لہجہ ناگوار ہو گیا۔

"اگر ایسا ہے تو شاید آپ نے کبھی سچے دوست نہیں بنائے۔" اس نے اپنی نگاہوں کا رُخ میرم کی جانب موڑا۔ وہ کھوجتی ہوئی نگاہوں سے آسمان تک رہی تھی۔

"بنائے تھے۔" مدھم یاسیت بھرا لہجہ۔

"پھر؟" وہ چند لمحے خاموش رہی۔

"سب پیچھے رہ گئے۔ کچھ بچپن کی دھول میں کھو گئے اور کسی نے مجھے ہی دھول سمجھ کر اڑا دیا۔" وہ بے دھیانی میں کہہ رہی تھی۔ محراب نے سنجیدگی سے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"آپ نے پھر نئے دوست نہیں بنائے؟"

"اب نہیں بناتی۔" اس کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ دل میں برسوں پرانا قلق سر اٹھانے لگا۔

"کیوں؟" اس نے مزید کریدا۔

""""سانپ کا ڈسا رسی سے بھی دور بھاگتا ہے۔" آپ نے یہ کہاوت تو سنی ہو گی؟" وہ مسکرائی مگر وہ مسکراہٹ اس کی آنکھوں تک نہ پہنچ سکی۔

"اعتبار کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے ایک بار کسی رشتے سے اٹھ جائے تو دوبارہ ویسا نہیں بن پاتا۔اور اگر پرانی دوستی کا زخم گہرا ہو... (وہ رکی اور پھر نفی میں سر ہلایا) پھر تو نئے دوستوں پر بھروسہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی۔

"نئے دوستوں کے ساتھ ہم چاہ کر بھی ویسے فلٹر فری نہیں رہ سکتے جیسے پرانے دوستوں کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ان میں ہم پرانی دوستی کی شبیہہ ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں۔ان کے ہر جذبے اور خلوص کو شک کی نگاہ سے دیکھ کر ہم اپنی ہی ذات کو مسخ کر دیتے ہیں۔اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی۔"آخر میں اس کی آواز میں انجانا سا کرب آسمایا تھا۔محراب نے تسلیمی انداز میں سر ہلایا۔

"بڑے بہن بھائی چھوٹوں کے لیے رول ماڈل ہوتے ہیں۔وہ ہر کام، ہر کامیابی انہیں سے سیکھ کر بڑے ہوتے ہیں۔ایسے میں اگر بڑوں کی ذات میں خلا ہو تو وہی خلا چھوٹوں میں ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔ایسے کہ چھوٹے بھی اسی ادھورے پن کے ساتھ ساری زندگی خود سے جنگ لڑتے رہتے ہیں۔اور بڑوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔"آخری بات اس کے انداز میں کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔میرم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

ناولز کلب
Club of Quality Content

''میں اپنی تعریف نہیں کر رہا، مگر اتنا جانتا ہوں کہ میں برا دوست نہیں ہوں۔ فیضان کو تھوڑی سی اسپیس دیں۔ اسے خود فیصلہ کرنے دیں کہ کون اچھا ہے اور کون نہیں۔'' میرم نے پلکیں جھپکائیں۔

''اگر آج وہ آپ کے تجربے کی بنا پر دوستی کو ٹھکرائے گا تو اکیلا رہ جائے گا۔ اس کے ساتھ آپ کو بھی یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہر دوست برا نہیں ہوتا۔ ان کی صحبت میں رہ کر پتا چلتا ہے کہ وہ اچھے ہیں یا برے۔'' میرم غائب دماغی سے اسے سن رہی تھی۔ کچھ تھا جس نے میرم کو حال سے کھینچ کر ماضی میں جا پٹخا تھا۔ اس کے دل میں درد اٹھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر دوستی اتنی ہی خوبصورت ہوتی ہے تو یہ اتنا درد کیوں دیتی ہے؟ دوست بچھڑ کیوں جاتے ہیں؟ دل ٹوٹ کیوں جاتے ہیں؟ مگر وہ لبوں پر قفل لگائے بیٹھی رہ گئی۔

''ہر ہاتھ دھوکا دینے کے لیے نہیں بڑھتا۔ کچھ ہاتھ تاعمر ساتھ دینے کے لیے بھی ہوتے ہیں۔'' وہ نرمی سے کہتا ہوا قدم بہ قدم وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔ میرم کچھ دیر گردن موڑے اس کی خالی کی گئی جگہ کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کی نظر کافی کے مگ پر پڑی اور طنزیہ مسکان نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ وہ یونہی خود ساختہ سوچوں سے الجھتی، کپ پر نظریں جمائے بیٹھی رہ گئی۔

☆...☆...☆

رات کی تیرگی نواب ہاؤس پر اپنے سائے پھیلاتے ہوئے تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ بیرونی احاطے میں لگے برقی قمقموں کے مقابلے میں اندر پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کچن میں کھڑی تھی۔ برنر پر رکھا پانی ابل رہا تھا اور وہ بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھتی اپنے خیالوں میں گم تھی۔

''بھابی!'' اچانک ابھرنے والی آواز پر وہ ڈر کے مارے اچھل پڑی۔

''آپ ڈر گئیں؟'' وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''باز آجاؤ تم۔'' نور فاطمہ نے برنر بند کرتے ہوئے سانس پین اٹھالیا۔

''کچھ ایسا کہیں جو میں کر بھی لوں۔'' مہروز مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے فریج کی جانب بڑھا۔ وہ اس وقت برگنڈی رنگ کی شرٹ اور سیاہ ڈریس پینٹ پہنے ہوئے ہمیشہ کی طرح بے فکر دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا کر رہی ہیں؟'' وہ پانی پیتے ہوئے نارمل انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''وہی جو پچھلے آٹھ سال سے کر رہی ہوں۔''اس کا لہجہ بے ساختہ سرد ہو گیا۔مہروز نے اس کے چہرے پر پھیلی اداسی کو بغور دیکھا۔آنکھوں تلے ہلکے اس کے رت جگے کی گواہی دے رہے تھے۔

''یعنی ماں ہونے کے فرائض انجام دیے جا رہے ہیں؟''اس کے لہجے میں شرارت تھی۔نور فاطمہ نے ٹاپ فیڈ کے لیے دودھ بناتے ہوئے اسے ایسی نگاہ سے دیکھا کہ وہ بلاارادہ نظریں چرا کر رہ گیا۔

''کیا چاہیے تمہیں؟''اس نے پوچھ لینے میں ہی عافیت جانی۔وہ ایک ہی جست میں کچن آئلینڈ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

''چائے بنا دیں اور کھانا گرم کر دیں۔آپ کی عین نوازش ہو گی۔''

''اپنی بیوی سے کہو۔میں تمہاری خدمت نہیں کر سکتی۔''لہجہ ناخوشگوار ہو گیا۔

''بیوی میری خدمت کر سکتی ہوتی تو تم سے کیوں کہتا؟''وہ ''آپ'' سے ''تم'' پر آ گیا تھا۔اس کی اس بے تکلفی پر نور فاطمہ کے چہرے پر الجھن بھرے تاثرات ابھر آئے۔

”اس نے تمہیں میرے ساتھ کھڑا دیکھ لیا تو تمہیں گنجا کر دے گی۔“اس کے ترش لہجے کے جواب میں مہروز کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔وہ سر پیچھے ڈال کر ہنستا چلا گیا۔چند لمحوں بعد جب وہ بولا تو لہجے میں گزرے دنوں کی یاد کا احساس تھا۔

”تمہیں یاد ہے یونیورسٹی میں...“

”مجھے کچھ یاد نہیں۔ایکسکیوزمی۔“وہ اس کی بات کاٹتی ہوئی فیڈر لیے باہر کی جانب بڑھی۔ مہروز کا چہرہ خجالت سے سرخ ہو گیا۔آنکھوں میں ملال اتر آیا۔

”نور فاطمہ...“وہ ٹھٹھک گئی۔یہ نام،یہ لہجہ،یہ پکارنے کا انداز کتنا اجنبی تھا اس کے لیے۔مقابل کھڑی عورت کا دل ایک لمحے کو ساکت ہوا۔اگر کسی نے انہیں ساتھ دیکھ لیا تو؟وہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔آگے بڑھنے کی ہمت ہوئی نہ ہی وہ پلٹ کر اسے دیکھ سکی۔

”آئی ایم سوری...“وہ کسی ٹرانس میں بولا۔کچھ تھا جو اس کے لہجے سے عیاں ہو رہا تھا۔کچھ تھا جو کچن کی در و دیوار بھی محسوس کر رہے تھے۔وہ قدم بہ قدم چلتا ہوا دروازے کی دہلیز پر کھڑی نور فاطمہ کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"میں شرمندہ ہوں۔میں سچ کہہ رہا ہوں میں شرمندہ ہوں۔" وہ واقعی اپنی لغزش پر نادم تھا۔اور جو اس کے مقابل تھی، وہ لہجہ شناس تھی۔اسی لہجے نے اسے اپنے گزرے ماہ و سال یاد دلا دیے۔

وہ سب... جس کے لیے وہ نواب ہاؤس آئی تھی۔وہ خواب...جو نواب ہاؤس کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی دم توڑ گئے تھے۔اور پھر آٹھ سال کا وہ اندوہ ناک عرصہ جس نے نور فاطمہ کو بھٹی میں سلگتی آگ کی مانند جلایا تھا۔وہ یہ اذیت کیسے بھول جائے؟

مہروز کب چلا گیا، اسے خبر بھی نہ ہوئی۔وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔کچن کی در و دیوار بھی اسے گم صم دیکھ کر خاموشی سے رنجاں ہوئی۔

ناولز کلب
Clubb of Quality Content

لوگ کیوں ہمارے پاس اپنے کرموں کی تلافی کرنے آجاتے ہیں؟

کوئی انہیں بتائے کہ مداوا غلطیوں کا ہوتا ہے، گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے...اور کسی کا دل توڑنے سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے؟

☆...☆...☆

دوپہر کی دھوپ اپنے جوبن پر تھی۔ ہلکی ہوا ماحول کو جہنم نما بننے سے ناکام بنا رہی تھی۔ سڑک کے کنارے کھڑے نیم کے درختوں کے سائے سہ پہر کے ساتھ لمبے ہوتے جا رہے تھے۔

میرم آج اسکول سے واپسی پر خلافِ معمول مختلف موڈ میں تھی۔ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ سبز رنگ کے سوٹ میں ملبوس، وہ ہم رنگ چھوٹے جھمکے پہنے، بالوں کو کھلا چھوڑے ہوئے تھی۔ سبز مخملی دوپٹہ سر پر اٹکا ہوا تھا، جو بار ہا اس کے بالوں کی نرمی و نزاکت سے ڈھلک جاتا۔ چادر شانوں پر لپٹی ہوئی اور نگاہیں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔

فیضان آج چھٹی پر تھا اس لیے وہ اسکول سے اکیلے گھر واپس جا رہی تھی۔ وقت پرانا ہوتا یا پچھلے دو سال کا عرصہ اس کی زندگی سے محو ہو جاتا تو وہ میرم ریحام تنہا باہر نکلنے سے ڈرتی تھی مگر اب... اب وہ ڈرنا چھوڑ چکی تھی۔ زندگی کے سارے ڈراوے اب اسے معمولی، بے معنی اور ہیچ معلوم ہوتے تھے۔

گاڑی کے اگلے دو شیشے ادھ کھلے تھے۔ مرکزی شاہراہ سے ذیلی سڑک پر اترتے ہوئے اس نے احتیاطاً سائیڈ مرر میں نگاہ ڈالی۔ تھوڑا آگے بڑھنے کے بعد اس کی نظر سڑک کے بائیں جانب چلتے شخص پر پڑی۔ وہ دھوپ میں پیدل چل رہا تھا۔ اس وقت وہ سیاہ پینٹ اور آسمانی

رنگ کی فل سلیو شرٹ میں ملبوس، سر پر پی کیپ رکھے ہوئے تھا۔ شرٹ پر پسینے کی بوندیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔

''اُفف۔ پاگل ہے یہ لڑکا؟'' وہ ماتھے پر شکن لیے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ کوئی سواری ہی لے لیتا۔ بھلا اتنی دھوپ میں پیدل چلنے کی کیا تک بنتی تھی؟ اس کے قریب پہنچتے ہی میرم نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔ کیا وہ محراب قریشی کو لفٹ دینے والی تھی؟ کیا وہ اس پر اتنی بڑی عنایت کر سکتی تھی؟

''کہاں جا رہے ہو؟'' اس کے قریب گاڑی روک کر اس نے کھڑکی سے سرسری لہجے میں دریافت کیا۔ محراب چلتے چلتے رک گیا۔ قدموں کی رفتار کے ساتھ آنکھیں بھی ٹھٹھکی تھیں۔ اس نے چونک کر چہرہ موڑا۔ دائیں جانب وہ گاڑی لیے کھڑی تھی۔ چہرہ پر مسرت مگر پیشانی حسبِ معمول شکن آلود۔ آفرین تھی اس لڑکی پر، مجال جو وہ کبھی بے شکن پیشانی کے ساتھ بات کر لے۔

''وہیں... جہاں سب جاتے ہیں... اپنے گھر۔'' وہ بے لچک انداز میں بولا تھا۔ ایک تو دھوپ... اس پر یہ خاتون!

''تو دھوپ میں پیدل چلنے کی کیا ضرورت ہے؟''

”وہ کیا ہے نا کہ میرے ابا حضور وراثت میں میرے لیے گاڑی چھوڑ کر نہیں گئے۔“ وہ طنزیہ مسکان لیے بولا۔ میرم نے خفت سے اس کی جانب دیکھا۔ اسے کیسے معلوم کہ یہ گاڑی اس کے بابا کی ہے؟

”گھر دور ہے۔ آجاؤ لفٹ دے دیتی ہوں۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے پیسنجر سیٹ کے دروازے کا لاک کھول دیا۔

”آپ روز لفٹ دیتی ہیں سب کو؟“ اس کے سوال پر میرم نے اچھنبے سے اسے دیکھا۔

”نہیں تو۔ روز سب کو نہیں دیتی... لیکن تم پر ترس آگیا ہے۔“ اس کا سنجیدہ ہوتا انداز محراب نے بغور نوٹ کیا۔

”یونہی راہ چلتے لوگوں پر ترس کھا کر لفٹ دے دینا اچھی بات ہے کیا؟“ وہ بحث پر اتر آیا۔ میرم نے اسے تیکھی گھوری سے نوازا۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ اس نے دانت پر دانت جمائے اس پر سے اپنی نظریں ہٹالیں۔ اور اس سے پہلے کہ وہ گاڑی آگے بڑھاتی، محراب تیر کی تیزی سے دروازہ کھولتا گاڑی میں بیٹھا تھا۔ میرم نے لب دبائے۔ تپتی دوپہر میں بھلا اس کی انا بھی کتنی دیر قائم رہ سکتی تھی؟

”اگر تم یونہی دھوپ میں پیدل چلتے رہے تو عنقریب پہچانے نہیں جاؤ گے۔“ وہ اس کی سفید رنگت میں گھلتی سرخیوں پر چوٹ کر رہی تھی۔ محراب سر جھکائے ہنس دیا۔

"آپ کی طبیعت آج کافی خوشگوار لگ رہی ہے۔" اس نے اندازہ لگایا۔

"ہاں! میرے اسکول میں ایک مسئلہ حل ہوا ہے... بس اسی لیے۔"

"کس مسئلے نے خوش کر دیا آپ کو؟"

"لمبی کہانی ہے۔" وہ ٹال گئی۔ محراب نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"مختصراً یہ کہ آج دل ہلکا ہے۔" لب آپ ہی آپ مسکرا اٹھے تھے۔ دوپٹہ بالوں سے سرکتا ہوا کندھوں پر جا ٹھہرا۔ محراب کی نگاہیں اس کے سیاہ، نرم، چمکدار گیسوؤں کی ریشمی لطافت پر ٹھہر گئیں۔ گلے میں گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔ لمحوں میں منظر پر فسوں سا طاری ہو گیا تھا۔

"دل ہلکا ہونا بھی بڑی نعمت ہے۔" وہ دھیرے سے بولا اور گہری سانس بھر کر نظروں کا رخ موڑ گیا۔ اس کے سیاہ گیسوؤں کی نرمی و ملائمت نے طلسماتی ماحول میں گویا خوشبوئیں بکھیر دی تھیں۔ محراب قریشی کے دل کی دنیا تھی، جو ایک لمحے میں تہہ و بالا ہوئی تھی۔

☆...☆...☆

کمرہ زرد روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اے سی کی ٹھنڈک حبس زدہ ماحول سے نجات دلانے میں کامیاب ہو رہی تھی۔ فرنیچر اور در و دیوار سیاہ اور سنہری رنگوں سے مزین تھے۔ جہازی سائز بیڈ کے اوپر ایک پورٹریٹ آویزاں تھا۔ جس میں نواب مہروز عباسی کا عکس جھلک رہا تھا۔ وہ

شہادت کی انگلی سے ابرو کے قریب موجود نشان کو کھرچتے ہوئے، اپنی بائیک سے ٹیک لگائے، ایک پیر آگے اور دوسرا پیچھے رکھے کھڑا تھا۔

وہیں ایک طرف قرمزی کرٹنز والی دیوار گیر کھڑکی کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ سیاہ شیفون کی ٹخنوں کو چھوتی انگرکھا فراک میں ملبوس، دوپٹہ کندھوں پر پھیلائے ہوئے، اس کی نگاہیں باہر سے نظر آتے تاریک آسمان پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں جھلملاتے ستارے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ دفعتاً اس نے چہرہ موڑا۔ زرد بتیوں میں اس کا چہرہ نظر آیا تھا۔ تراشیدہ ابرو، کاجل سے سجی آنکھیں، سرخ لپ اسٹک سے مزین ہونٹ اور سفید و گلابی رنگت...

'گیارہ بج کر اٹھائیس منٹ۔' اس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ آنکھوں میں غصہ امڈ آیا۔ لب بھینچ کر اس نے واپس اپنا رخ موڑ لیا۔ اب کہ اس کے چہرے کے نقوش تن چکے تھے۔ آنکھوں میں ہلکی سی سرخی نے جگہ لے لی تھی۔

اس کی آنکھیں سبز تھیں۔ جس کو دیکھتی تھیں، نگل لیتی تھیں۔

تبھی دروازے کا لاک کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ اس نے رخ نہیں موڑا البتہ کھڑکی کے پردے پر رکھا اس کا ہاتھ سخت ہوا تھا۔

کوئی سیٹی کی مدھر دھن بجاتا اندر داخل ہوا اور یکایک ڈریسنگ ٹیبل پر کچھ رکھنے کی آواز کے ساتھ ہی سیٹی کی دھن ختم ہو گئی۔ مبادا مقابل شخص اسے وہاں کھڑے دیکھ چکا تھا۔

"تم یہاں؟" وہ اسے وہاں دیکھ کر تھوڑا حیران ہوا۔

"اپنے کمرے میں آنے کے لیے مجھے کسی کی اجازت نہیں چاہیے۔اور یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا؟" الٹا سوال ہوا تھا۔اس نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اس کی جانب قدم بڑھائے۔اتفاقاً وہ بھی آج سیاہ رنگ میں ملبوس تھا۔

"ڈئیر میرال ہاشمی غصے میں ہیں۔" اس کے پہلو میں کھڑے ہوتے، نظریں بالکنی پر جماتے اس نے تمسخر سے کہا تھا۔

"تو کیا نہیں ہونا چاہیے؟" اس نے رُخ موڑے بغیر کہا پھر نظریں پھیر کر مہروز کو دیکھا۔ چوڑا سینہ، ہاتھ پشت پر باندھے، گردن قدرے اٹھائے، ہلکی بئیرڈ اور آنکھوں میں کوئی سوچ لیے کھڑا وہ شخص دیوتاؤں سا حسن رکھتا تھا۔اور سونے پر سہاگا وہ شخص میرال ہاشمی کا نصیب تھا۔وہ دونوں رات کی تاریکی میں ڈوبتے ستاروں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

"میری بلا سے۔" زیرلب کہتے ہوئے اس نے گویا اس کی پہلے سے پھڑکتی رگ پر پیر رکھ دیا۔وہ تلملا کر اس کی طرف پوری طرح گھومی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟ میں پاگل ہوں جو یہاں تیار ہوئے تمہارا انتظار کرتی رہی ہوں؟ اور تم اپنی کلاسیکی فطرت سے عاجز مخلوق... ہمیشہ دیر سے آتے ہو۔" مہروز کے سامنے اگر کوئی بولنے کی جرأت کر سکتا تھا تو یہ ہمت صرف میرال میں ہی پائی جاتی تھی۔

''تمہاری زندگی میں سکون نہیں ہے۔ ہر وقت طعنے دے دے کر دل نہیں بھرتا تمہارا؟'' وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔

''تمہاری بیوی ہوں، اسی لیے نہیں بھرتا۔'' وہ بھی دوبدو بولی۔

''ہاں تو بیوی بن کر رہو نا، ماں کیوں بن رہی ہو میری؟'' اس نے ترنت جواب دیا تھا۔ غصے میں لپٹی بھڑکیلی آواز پر سبز آنکھوں میں چنگاریاں ابھرنے لگیں۔

''مہروز؟'' اس نے دکھ سے اسے پکارا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ لمبے تراشیدہ ناخن ہتھیلیوں میں پیوست ہو گئے۔

''بندہ تھکا ہارا گھر لوٹتا ہے اور مجال ہو جو اس گھر میں سکون کے دو پل بھی نصیب ہو جائیں، چوبیس گھنٹے دنگل فساد ہی مچا رہتا ہے یہاں۔'' اس نے سر جھٹکا۔ پہلے ہی وہ بزنس کے معاملات سنبھال کر دیر سے لوٹا تھا اور ادھر اس کی بیگم صاحبہ نے اپنا الگ ہی پینڈورا باکس کھول رکھا تھا۔

''میں تمہیں فسادی لگتی ہوں؟'' اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

''میں نے ایسا تھوڑی کہا ہے۔'' وہ پہلو بچا گیا۔

''کتنے دوغلے ہو تم۔'' مہروز کے چہرے پر پھیل رہے کرخت تاثرات میرال کو مزید بھڑکا گئے تھے۔ کیوں وہ اس کے ساتھ نارمل نہیں رہ سکتا تھا؟

''بس بہت ہوا۔اپنی حد میں رہا کرو۔'' وہ سختی سے ڈپٹ کر رہ گیا۔

''یہی حدود اپنے لیے کیوں نہیں متعین کرتے تم؟'' سیاہ آنکھوں کی بردباری دیکھ کر وہ آہستہ آواز میں بڑبڑائی تھی۔

''میری مرضی۔'' اس نے کاندھے اچکائے۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے مہروز؟ تم پہلے تو ایسے نہیں تھے۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔ حلق میں کچھ اٹکا تھا۔

''اوہ ہیلو۔میرے ساتھ یہ روٹھی محبوباؤں والا ڈھونگ نہیں چلے گا۔مجھے زر کی کمی ہے نہ زن کی۔'' اس کا انداز نڈر تھا۔

''بالکل تمہارا ایک سے دل نہ بھرا تو دوسری کر لو گے، دوسری سے نہیں بھرے گا تو تیسری کر لو گے۔'' وہ حزن میں ڈوبی کہہ رہی تھی۔ مہروز نے شرربار نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''اور اگر تیسری سے بھی دل نہ بھرا تو چوتھی کر کے سنتِ رسول پوری کروں گا۔کوئی مسئلہ؟'' دایاں کٹ والا ابرو اچکائے اس نے گویا اس معاملے پر مٹی ڈالی تھی۔

''مہروز...تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟'' وہ ششدر رہ گئی۔

''مرد ہوں، کر سکتا ہوں۔'' آہ! یہ بے نام مردانگی کا زعم۔

کیا مرد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو ہر ظلم پر اختیار حاصل ہو جائے؟

"طاقت کے نام پر ظلم کرنا کسی کو مرد نہیں ظالم بناتا ہے۔ سچ بتاؤ... تم عاجز آ گئے ہو نا مجھ سے؟" میرال کی دھاڑتی آواز اور اس کے اگلے قدم پر مہروز اپنی جگہ ساکت ہوا تھا۔ نظریں اس کے سفید مومی ہاتھوں پر گئیں جن سے وہ اس کا گریبان تھامے کھڑی تھی۔

"میرا... دماغ... خراب... مت... کرو۔" اس نے اس کے ہاتھ جھٹک کر خود کو آزاد کیا اور اسے زور سے پیچھے کی جانب جھٹکا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔

"آئندہ یہ ہاتھ میرے گریبان تک آئے تو رہنے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔" وہ غصے سے بولا پھر گریبان سے نادیدہ گرد جھاڑتے ہوئے پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باتھ روم میں چلا گیا۔

"تم میری برداشت کی حد آزماؤ مہروز... میں تمہارے غصے اور غرور کی حد آزماؤں گی۔ میں آگ ہوں اور آگ سے کھیلنے والے اکثر راکھ ہو جاتے ہیں۔" وہ دل ہی دل میں جل کر بھسم ہوئی تھی۔

"اپنی چال چل کر میرے وار کا انتظار کرنا کیونکہ میرال ہاشمی کا وار سہنا آسان نہیں۔" وہ غصے سے ابلتی آنکھیں لیے باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ اور یہی اس کی حقیقت تھی کہ شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا تھا۔

☆...☆...☆

اگلے دن کا مطلع ہر گز صاف نہیں تھا۔ موسم آبر آلود ہو رہا تھا۔ ان کی گاڑی سڑک پر رکی کھڑی تھی۔ سامنے سے بھیڑوں کا ایک ریوڑ گزر رہا تھا۔ دو نو عمر لڑکے ہاتھوں میں چھڑیاں تھامے انہیں گھر واپس لے جا رہے تھے۔ اس نے کوفت سے ونڈ سکرین سے سر ٹکایا۔ سر پر چادر لیے، گرے اور سرخ رنگ کے امتزاج کا سوٹ پہنے وہ ہاتھوں میں جڑے کنگن پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ یکا یک اے۔سی کے باوجود اسے گاڑی کی فضا میں گھٹن محسوس ہونے لگی۔

اس نے چادر کے پلو سے گردن پر آئے نادیدہ پسینے کو صاف کیا۔ تبھی اس کی نگاہ بھٹکی۔ اس نے دیکھا، کوئی ان کی گاڑی کے قریب سے ناک کی سیدھ میں گزر رہا تھا۔ سیاہ شیشوں کے پار سے بھی اس شخص کی گوری رنگت اور پیشانی پر بکھرے بالوں تلے ابھرتے بل نظر آ رہے تھے۔ سفید کُرتا پاجامہ پہنے وہ دائیں کلائی میں گھڑی پہنے ہوئے تھا۔

وہ کامل حسن کا مجسمہ تھا جو میرال ہاشمی کے حواسِ خمسہ چھین کر لے گیا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ جو چند قدم آگے بڑھ کر ایک بزرگ کے سامنے ٹھہر گیا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو خم دیا۔ جواباً اُس بزرگ نے اپنی لاٹھی بائیں ہاتھ میں تھامی اور دایاں جھریوں بھرا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا۔ اس کے نرم و ملائم بال ذرا سا لمس پاتے ہی بکھر گئے تھے۔

اب وہ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے، پر شفیق اور مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بزرگ کی بات سن رہا تھا۔ پھر وہ اس کا کندھا تھپتھپاتے اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میرال نے اسے پلٹتے دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹ 'آمین' کی صورت میں ہلتے دیکھے۔ مُسکراتا چہرہ آہستہ آہستہ سنجیدہ ہوتا گیا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا اور عجلت بھرے انداز میں آگے بڑھ گیا۔

'رعب ایسا کہ لوگ نگاہ ملانے سے بھی گریز کرتے، مگر کشش ایسی کہ نظر ہٹانا مشکل ہو جاتا۔'

بروقت اس کے دل نے دلیل دی تھی۔

اسکی نگاہیں خالی جگہ پر ٹکی رہ گئیں۔ وہ کون تھا؟ کون تھا وہ جس نے میرال کی سدھ بدھ ختم کردی تھی؟ اتنی بے ساختگی، اتنا محو انداز؟ ایک انجانی سی کیفیت اس کے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ خود کو سمجھنے سے قاصر ہوئی۔

میسج ٹون کی آواز پر وہ چونکی۔ گاڑی میں چھایا سارا فسوں ٹوٹ گیا۔ جادوئی لمحوں سے نکلتے ہوئے اس نے موبائل کی سکرین روشن کی۔

''میں آج رات گھر نہیں آؤں گا۔ پریشان مت ہونا اور کھانا کھا کر سو جانا۔'' مہروز کا پیغام جگمگا رہا تھا۔ اس نے سکرین واپس تاریک کردی۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ چند لمحے

پہلے کا منظر اسے کہیں بہت پیچھے لے گیا تھا۔ وہ سب بھی تو ایسے ہی شروع ہوا تھا۔ یوں ہی، پہلی نظر کی تاثیر نے اس کے دل کی دنیا تلپٹ کی تھی۔ یہی تو وہ نظریں تھیں جنہوں نے میرال ہاشمی کے دل کے کواڑ چاک کیے تھے۔

"خضر علی!" اس کی مدھم، سرسراتی آواز پر پیسنجر سیٹ پر بیٹھے شخص نے گردن موڑی۔ گاڑی راستہ صاف ہوتے ہی چل پڑی تھی۔

"حکم، بیگم صاحبہ۔" وہ تیس کے پیٹے میں قدم رکھتا، خوش شکل مرد، مہروز کا پرسنل سیکرٹری تھا۔ مگر نا جانے کیوں وہ مہروز کی نسبت میرال کا زیادہ تابع نظر آتا تھا۔

"یہ شخص کون تھا؟" بیک ویو مرر میں میرال کے منتشر حواس دیکھ چکے خضر کو سوال کرنے کی زحمت پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر گردن واپس سیدھی کر لی۔

"میرم ریحام کا نیا کرایے دار۔" جملہ سادہ تھا مگر اثر غیر متوقع۔ اس کے جواب نے میرال کے دل میں بھڑکتی آگ کو مزید ہوا دی تھی۔ اس کی انگلیاں موبائل پر اس قدر سختی سے جکڑ گئیں کہ ہاتھوں کی باریک نسیں نمایاں ہونے لگیں۔ خضر نے آئینے میں اس کے چہرے پر چھائی سرد مہری اور کراہیت دیکھ کر لب بھینچ لیے۔

"میرم!" میرال کے لبوں سے بے ساختہ پھسلا۔ خیالوں کی ڈور کہیں دور جا الجھی۔ تاحدِ نگاہ پھیلی حویلی کو دیکھ کر اس نے گہری سانس لی مگر اب اس کی سانس سنبھل رہی تھی نہ حواس۔

☆...☆...☆

وہ کچن میں کھڑی تھی۔ چہرے کے ناگوار تاثرات چھپائے، بددلی سے چولہے پر رکھی چائے کو تک رہی تھی۔ قہوہ کڑھ کر سیاہ رنگ اختیار کر چکا تھا۔ مگر اس میں دودھ شامل کرنے کی بجائے اس کی تمام حسیات صحن کی جانب کھنچی ہوئی تھیں۔ صحن میں جھانکو تو پلنگ پر بچھی سندھی طرز کی چادر پر شازیہ بیٹھی تھیں۔ ان کے قریب ہی ایک موڑھے پر تیس پینتس کے لگ بھگ عورت بیٹھی مسلسل زبان کے نشتر چلا رہی تھی۔ ان کے تلخ الفاظ شازیہ کے اعصاب پر وار کر رہے تھے۔ کچن میں کھڑی میرم ریحام کی سماعتیں بھی ان کی زبان کی کڑواہٹ سے بوجھل تھیں۔ اس نے لب بھینچے، اوپری خانے سے الائچی نکالی۔ دو دانے زور سے کچل کر کیتلی میں ڈالے اور سختی سے ڈھکن بند کر دیا۔

"شازیہ بہن، تم خود ہی سوچو... آج کے زمانے میں کون اپنے سر پر جوان مرد پال کر رکھتا ہے؟" سکینہ خالہ کی نخوت بھری آواز ابھری۔

"زمانہ ویسے ہی خراب ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ گھر میں جوان لڑکی اور اوپر ا جنبی مرد..." ان کے طنزیہ انداز پر میرم کے کپ دھوتے ہاتھ ایک لمحے کو ٹھٹھکے تھے۔ وہ جبڑے بھینچ کر رہ گئی۔ یہ وہی سکینہ خالہ تھیں جنہوں نے ماں کو کرایے دار رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ طنزیہ مسکرائی۔

"وہ مسافر ہے۔پڑھالکھااور شریف بھی ہے۔بیچارے کو ٹھکانا چاہیے تھا سو ہم نے دے دیا۔اس میں قباحت کیا ہے؟"شازیہ نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

"قباحت؟(وہ طنزیہ ہنسی ہنسیں)بہن۔دنیا میں رہنے کے لیے دنیاداری کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔آج کل کی نسل کے لڑکے شکل سے تو سیدھے سادے لگتے ہیں،مگر نیتوں کا کیا بھروسہ؟کل کو اگر کوئی بات بن گئی تو لوگ تمہاری بیٹی پر ہی انگلیاں اٹھائیں گے،اس مسافر کو کون جانتا ہے؟"ٹرے لے کر صحن میں قدم رکھتی میرم نے صبر کا گھونٹ بھرا تھا۔کمال تھا جو وہ اب تک خاموش کھڑی تھی ورنہ ایسے لوگوں کی زبانیں بند کروانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔مگر پھر وہی ماں کی نصیحتیں یاد آجاتی تھیں۔وہ زبردستی ہونٹ پھیلائے آگے بڑھی اور چائے شازیہ کے قریب پلنگ پر رکھ دی۔

"ہائے بیٹی شکر ہے تو چائے لے آئی۔شدید طلب تھی اس کی۔"انہوں نے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے فوراً چائے کا کپ اٹھایا۔شازیہ اور میرم ان کی پھرتی پر اپنے آپ میں ہی شرمندہ ہو کر رہ گئیں۔

"ویسے پُتر،مجھے تجھ پر پورا بھروسہ ہے۔مگر پھر بھی تم اس کرایے دار کے منہ مت لگنا۔"کسی نے میرم ریحام کے قدموں تلے سے زمین بے دردی سے کھینچی تھی۔ایک چیخ

تھی جو اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی، ایک درد تھا جو پورے وجود میں پھیل کر اسے سن کر گیا۔ کیا کسی کو یوں بھی لفظوں سے چھلنی کیا جاتا ہے؟

سیڑھیوں کے آغاز پر آکر کھڑے ہوئے محراب کے بھی قدم منجمد ہوئے تھے۔ ان کی گوہر افشانی پر اس کی سرمئی آنکھوں میں سرخ شعلے بھڑک اٹھے تھے۔

"جس تھالی میں کھا رہی ہیں اسی میں چھید کر رہی ہیں۔ خالہ، آپ بھی کمال کرتی ہیں۔" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ شازیہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں۔

"میں نے کیا کیا ہے؟ سچ ہی تو کہا ہے۔ اور محلے والوں کی باتیں سنی ہیں تم نے۔ تمہارا کردار مشکوک ہو رہا ہے۔" میرم کو برآمدے میں غائب ہوتے دیکھ کر انہوں نے اونچی آواز میں کہا تھا۔ پھر بڑے مزے سے چائے کی چسکی بھری۔ اگلے ہی لمحے چائے کسی پھوار کی صورت ان کے منہ سے نکلی تھی۔

"ہائے ہائے۔ یہ چائے ہے یا نمک کا گھول۔ بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں۔ مارنے کا ارادہ ہے کیا؟" کپ ٹرے میں پٹختی، وہ چیخ اٹھی تھیں۔ سیڑھیاں اترتے محراب نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔ واللہ! یہ محترمہ اپنے نام کی ایک تھیں۔

"غلطی سے نمک ڈل گیا ہو گا۔ درگزر کریں۔" شازیہ نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔

”بھولے سے ہوئی غلطیاں بڑا خوار کرواتی ہیں۔ سنبھالو اپنی بچی کو۔“ ان کی نصیحت پر میرم نے سر جھٹکا۔

”بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ کیا نام ہے اس بدقماش کا... ہاں محراب قریشی۔“ ان کے منہ سے نکلنے والے غلیظ الفاظ پر محراب کا چہرہ لہو لہو ہوا تھا۔

”ارے کیا تم بھول گئیں؟ گلِ ریگاں میں قریشیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔“ ان کے لبوں سے نکلے الفاظ نے شازیہ کو ایک لمحے کے لیے سن کر دیا۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش میں لب پھڑ پھڑا کر رہ گئیں۔

”اس محراب قریشی پر یقین نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔ کہیں تمہاری مروت تمہارے گلے ہی نہ پڑ جائے اور بعد میں عزت بچے نہ پیسہ۔ لٹیروں کا پھر بھروسہ بھی کیا ہے؟“ ان کی زبان بے لگام تھی۔ آنکھوں میں فتنہ بھری چمک ہلکورے لے رہی تھی۔

”میرے بارے میں بات کرنی ہے تو مجھ سے کریں۔ دوسروں کے کان زہر آلود نہ کریں۔“ سخت اور دبنگ لہجے کی ہنکار پر سکینہ خالہ نے چونک کر سامنے دیکھا۔ سفید رنگ کے سوٹ میں ملبوس وہ شخص، آنکھوں میں گہرا سکوت لیے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

”تو تم ہو قریشی۔“ انہوں نے سر سے لے کر پیر تک اسے دیکھا۔ محراب نے کوئی تاثر نہیں دیا۔

”ایسا کرایے دار ہو تو کون کمبخت مکان دینے سے انکار کرے گا؟“ ان کے مکارانہ انداز پر شازیہ کا دل لرز کر رہ گیا۔ میرم نے دہلیز پر کھڑے ہو کر صحن میں جھانکا۔ وہ سکینہ خالہ اور میرم کے درمیان سنگلاخ چٹان بنا کھڑا تھا۔

”اپنی زبان کو لگام دیں۔ آپ کی زبان کا زہر آپ کو ڈس بھی سکتا ہے۔“ اس کے الفاظ پر شازیہ نے ممنون نگاہوں سے اس کا چہرہ تکا جبکہ سکینہ خالہ ہکا بکا رہ گئیں۔

”اس گھر، اس گھر کے مکینوں اور مقیم سے آپ کا کوئی تعلق ہے نہ واسطہ۔ آئندہ اس گھر کی طرف یا میرم ریحام کی طرف انگلی اٹھانے سے پرہیز کیجیے گا۔ میں خاموش ضرور ہوں مگر اندھا یا بہرا نہیں۔“ دروازے کی اوٹ سے یہ سب دیکھتی میرم کے دل میں عجیب سا سکون اترا تھا۔ کسی نے پہلی بار اس کے گھر پر اٹھی انگلیوں کا رخ موڑا تھا۔ وہ اتنا کہہ کر پلٹا، نظروں نے میرم ریحام کی حیران نگاہوں تک کا سفر کیا تھا۔ پھر وہ نظریں چراتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

میرم نے پلکیں جھپکیں۔ آنکھوں کے کناروں پر جلن محسوس ہوئی تھی۔ اُن آنکھوں میں کچھ تھا۔ زمانے سے جدا، فاصلوں سے دور... اجنبیت سے پرے... وہ جذبہ اپنائیت کا تھا۔ اس کی حیرانی بجا تھی۔ دل کا گداز ہونا لازم تھا۔ اجنبیت کی فصیل کو کسی نے دبے قدموں، بنا کوئی چاپ پیدا کیے پاٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔

شاید زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے اس کے لیے، اس کے گھر کے وقار کے لیے، لوگوں کی بولتی زبانیں گنگ کی تھیں۔

☆...☆...☆

باسی شام ڈھل چکی تھی۔ عشاء کے بعد ہر جگہ سکون ہی سکون تھا۔ ہوا میں ہلکی نمی موجود تھی۔ اس اداسی کے سانپ کی طرح جو اس وقت اس کے دل میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ وہ بے چین تھی، مضطرب تھی اور کہیں کہیں پشیمان بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک اجنبی کو گھر میں پناہ دینا سو لوگوں کے منہ کھولے گا مگر اس نے آج تک لوگوں کی پرواہ نہیں کی تھی۔ اور پھر کچھ مجبوریاں بھی انسان سے وہ سب کروا لیتی ہیں جو کرنے کا وہ کبھی روادار نہیں ہوتا۔ زمانہ بہت عجیب تھا۔ جو لوگ فاقوں کے دنوں میں انہیں پانی تک نہ پوچھتے تھے، آج میرم ریحام اور اس کی ماں کی عزت و آبرو کی خاطر خود انہی کے گھر کا رُخ کر رہے تھے۔

وہ دونوں گھٹنے سینے سے لگائے، ان کے گرد اپنی باہوں کا حصار باندھے، ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی تھی۔ وہ رات کے سکوت کی مسحور لڑکی چاند و تاروں کو اپنا محور بنائے بیٹھی تھی۔

ستارے اس کے ساتھی تھے اور چاند اس کا ہمراز۔

"کیوں سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوتے پھر سے خراب ہو جاتا ہے؟" وہ ستاروں کو تکتی اپنی سوچوں میں گم تھی۔

"کیوں سب کچھ بھلانے کی چاہ میں آگے بڑھتا انسان ایک بار پھر ماضی کی گہری کھائیوں میں جا گرتا ہے؟" بھوری آنکھوں میں ملال اور حزن اکٹھا تھا۔

"اتنا اندھیرا کیوں چھانے لگا ہے کہ کوئی امید کی کوئی کرن نظر ہی نہیں آتی؟" وہ اپنی سوچوں کے گرداب میں ڈوبی رہتی اگر جو اپنے قریب آہٹ محسوس نہ کر پاتی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ دیکھے بغیر بھی بتا سکتی تھی کہ مقابل کون ہے۔ مقابل بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ گھٹنے اکٹھے کیے اور دونوں کہنیاں ان پر ٹکا دیں۔

"لوگوں کی باتوں سے غمزدہ نہ ہوا کریں۔ وقت کے ساتھ نہ لوگ یاد رہتے ہیں نہ ان کی کہی ہوئی باتیں۔" وہ بولا تو آواز قدرے آہستہ تھی۔ میرم نے اس کی پشت تکی۔ وہ اس سے چند قدم آگے بیٹھا تھا۔ نیم رخ میں اس کی سرمئی آنکھیں آسمان کو کھوجتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

"لیکن اس دل کا کیا کرے انسان؟" اس نے گہری سانس خارج کی۔

"دل اتنا مضبوط نہیں ہوتا۔ یہ ہر بات کو بھلا نہیں پاتا۔ اور باتیں اگر صرف باتیں ہوں تو شاید بھول بھی جائیں مگر جو باتیں دل پر نقش ہو جائیں... وہ کہاں مٹتی ہیں؟" میرم کا لہجہ سوگوار تھا۔ شاید شام میں ہوئی گفتگو کا اثر تھا جس کے سبب اس کے دل کا کرب امڈ آیا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا دماغ رات کے وقت ہر چیز کو دوگنا بڑا دکھاتا ہے۔ دکھ کو، خوف کو اور یادوں کو بھی کیونکہ رات میں دفاع کمزور ہو جاتا ہے۔ انسان آسانی سے خود پر حملہ کرتا ہے۔" وہ اس کی جانب پلٹ کر بولا۔ میرم کی پلکیں پھڑ پھڑائیں۔ وہ جواباً کچھ کہہ نہیں سکی۔ محراب نے اس کی بے چینی محسوس کرتے نظروں کو اس پر سے ہٹا لیا۔

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ جتنا جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ چند ثانیے بعد بولی تو آواز میں خراش تھی۔ محراب کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوتی دکھائی دی۔

"اب بھی وقت ہے ہماری زندگیوں میں دخل انداز ہونے کی بجائے تم اپنا کہیں اور ٹھکانہ ڈھونڈ لو۔ یہ معاشرہ تنہا عورتوں پر غیر مرد کی پرچھائی بھی برداشت نہیں کرتا۔" اس کے لب بھینچ گئے۔ چاند کی روشنی میں، میرم کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔

"تو معاشرہ ان عورتوں کو تحفظ بھی تو نہیں دیتا۔ گھر میں کھانے کے لیے لقمہ بھی نہ ہو اور انسان بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جائے۔ تب بھی آپ معاشرے کی فکر کریں گی؟ یہ سماج کبھی آپ کا ساتھ نہیں دیتا میرم۔ یہاں تو اپنے رشتے بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور آپ پرواہ کر رہی ہیں اس سو کالڈ معاشرے کی؟" آخری بات کسی تیر کی طرح اس کے دل پر آ کر لگی تھی۔ وہ فق چہرے، اور شل دماغ کے ساتھ محراب کو دیکھے گئی۔

"میں ساری زندگی کانٹوں پر چلی ہوں... اب مزید یہ چبھن نہیں سہہ سکتی۔" وہ بھاری دل کے ساتھ بولی۔ کبھی کبھی کتنا مشکل ہوتا ہے نا دل کا درد کسی غیر کے سامنے کھولنا؟

"لوگوں کی باتیں ختم نہیں ہوتیں۔ آج تعریف کریں گے، کل تنقید۔ انہیں سمجھانا وقت کا ضیاع ہے، خاموش رہنا عزت کا۔ پتا ہے کیا؟ **لوگ ہم پر ہنسیں گے، یہ سوچ کر ہم نے ہنسنا چھوڑ دیا ہے۔**" وہ اس کی بات قطع کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ میرم آزردگی سے مسکرا دی۔ کیوں تھا وہ اتنا پر سکون؟ کیا اسے ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا؟ کیا اسے اپنی عزت، اپنا وقار عزیز نہیں تھا؟

کیا واقعی وہ وہی تھا جو دکھتا تھا یا اس کی کہانی کچھ اور تھی؟ نا جانے کتنے پتّے تھے جو ابھی پلٹنے باقی تھے۔ جنہوں نے وہ راز افشاں کرنے تھے جو اس کی ذات سے جڑ چکے تھے۔

"تمہیں کیا معلوم جن بیٹیوں کے سر سے باپ کا سایہ چھن جائے، وہ بیٹیاں کیسے جیتی ہیں۔" اس کی زبان سے ادا ہوئے الفاظ نے محراب کے تمام دلائل، تمام تردید رد کر دیں۔

"باپ بہت پیارا ہوتا ہے نا؟" وہ ہولے سے مسکرایا۔ میرم نے گہری زکام زدہ سانس کھینچی۔ وہ ایک بار پھر سے آسمان کو دیکھنے لگا تھا اور میرم ریحام نیچے نظر آتی کشادہ گلی پر نظریں ٹکائے بیٹھی تھی۔

"کچھ زخم دل پر ایسے لگتے ہیں جو کبھی نظر نہیں آتے۔ جن کا مسیحا کوئی نہیں ہوتا۔ دن گزریں یا سال، ایک سال یا پانچ سال، وہ کبھی نہیں بھرتے... ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔ انہی زخموں میں سے ایک زخم کسی کی جدائی کا ہوتا ہے۔" رات کی تاریکی میں گلی سنسان پڑی تھی۔ دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رات کے آدھ پہر یہاں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اور میرم کے لیے یہی وقت اس کی خوش قسمتی کا ہوتا تھا۔

"اور میرے لیے وہ جدائی میرے باپ کی تھی۔ وہ میرے دوست تھے، میرے رازداں اور پھر.... (اس کی آواز رندھ گئی۔) وہ چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے حصے کی جگہ خالی ہو گئی۔ اب پیچھے ایک ایسا شگاف رہ گیا ہے جو کوشش کے باوجود پُر نہیں ہو سکتا۔" بہت کوشش کے باوجود بھی اس کا لہجہ نم ہو گیا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اپنے دل کا حالِ درد کسی سامع کو سنا رہی تھی اور محراب مکمل یکسوئی سے اسے سن رہا تھا۔

"باپ گھر کا سربراہ ہوتا ہے۔ اور جب نہیں ہوتا تو زندگی انسان کو جلتے انگاروں پر چلاتی ہے۔ سب کو لگتا ہے کہ بابا کے جانے کے بعد ہماری پریشانیاں بڑھ گئی ہیں۔ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہو پاتے، امی کو سودے سلف کی فکر رہتی ہے، فیضان کو اپنی معصوم خواہشات کا گلا دبانا پڑتا ہے۔ سب کو لگتا ہے کہ ہم پہلے جیسے نہیں رہے۔ ہم باپ کے جانے کے بعد غریب ہو گئے ہیں۔ جبکہ، مسئلہ غریبی نہیں مسئلہ یتیمی ہے۔" دو شفاف موتی اس

کے سرخ عارضوں پر بہتے چلے گئے۔ صد شکر کہ محراب اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔اس نے فوراً سے بیشتر ہاتھ کی پشت سے انہیں رگڑ ڈالا۔

”آپ کمزور نہیں ہیں میرم۔ کمزور وہ ہیں جو اپنی ’زبان‘ پر اختیار نہیں رکھتے۔“ محراب اسے خاموش دیکھ کر گویا ہوا تھا۔میرم کے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔نایاب ہوتے ہیں وہ لوگ جو آپ کو سن اور سمجھ سکیں۔اور وہ کب سے، بغیر کسی اختلاف کے، اسے سن رہا تھا۔

”یہ آپ کی اپنی زندگی ہے، اسے آپ نے خود جنت بنانا ہے۔“اس نے سمجھانے والے انداز میں میرم ریحام کو دیکھا لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔وہ نیچے گلی میں پڑتی روشنی کو دیکھ رہی تھی۔ٹارچ کی روشنی...جو دھیرے دھیرے ان کے گھر کے قریب آرہی تھی۔دائیں سے بائیں حرکت کرتی ہوئی....گویا کسی کی تلاش میں گم ہو۔

”محراب۔“اس نے سرگوشی میں پکارا، آواز لرز گئی۔محراب نے چونک کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھنا چاہا تھا۔جب...

”وہاں مت دیکھو۔“میرم نے غیر ارادی طور پر مضبوط جھپٹ کے ساتھ اسے کالر سے پکڑ پیچھے کی جانب کھینچا۔وہ لڑکھڑاتے ہوئے بمشکل سنبھلا تھا۔

تبھی کسی نے کچھ محسوس کرتے چھت پر روشنی ڈالی۔ادھر سے ادھر ٹکراتی روشنی ان پر پڑی تو دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔وہاں بیٹھے وہ دونوں وجود اس مصنوعی روشنی میں صاف

نظر آئے تھے۔میرم کی سانسیں ساکت ہوئی تھیں۔وہ تیزی سے پیچھے کی جانب کھسکی۔آنکھیں ابل کر باہر آگئیں۔محراب نے آگے بڑھ کر اسے تھامنا چاہا تھا مگر وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی ہوئی حیرت کی زیادتی سے پھٹی آنکھیں لیے پیچھے ہٹتی گئی۔

یکایک روشنی اچانک بند ہو گئی۔ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔

''میرم؟'' محراب نے بے آواز لب کشائی کی۔وہ ہر لمحے کے ساتھ مسمار ہوتی اس لڑکی کی آنکھوں میں پھیلتا ڈر و خوف با آسانی دیکھ سکتا تھا۔اس کا دل کسی انہونی کے خوف سے بے ساختہ دھڑکا۔کیا کچھ تھا جو غلط تھا؟کسی کے فون پر بات کرنے کی آواز سنائی دی اور پھر وہ آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ڈوبتے چاند نے ان کو دیکھ کر رات کے آخری پہر میں قدم رکھا تھا۔اور ٹھیک اسی لمحے ان دونوں کو اپنی غلطی کا احساس شدت سے ہوا تھا۔

اگر کوئی کہتا ہے کہ بدا چھا بدنام برا تو یقین کر لو... کیونکہ بدنام شخص واقعی برا ہوتا ہے۔

☆...☆...☆

جاری ہے...

مزید بہترین ناول/افسانے/آرٹیکل/مختصر کہانیاں اور معیاری شاعری پڑھنے کے لئے

نیچے دیئے گئے لنک پر کلک کریں۔

شکریہ!

ناولز کلب

Clubb of Quality Content!

www.novelsclubb.com

ہماری ایپ ڈاؤنلوڈ کریں اور رسائی حاصل کریں بے شمار مزے دار ناولوں تک

Download our app

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول،افسانہ،شاعری،ناولٹ،کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک،انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

03257121842